کلیاتِ شیخ الہندؒ

حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے کلام فارسی و اردو کا مجموعہ

مُرتّب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ناشر:

ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی

کلیاتِ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام فارسی و اردو کا مجموعہ

مُرتّب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری



تعارف مرتب:-

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی

ناشر

ربانی بک ڈپو
کٹرہ شیخ چاندلال کنواں دہلی ۶

کلیات شیخ الہندؒ — حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے کلام فارسی، اردو کا مجموعہ

مرتب :- ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری۔

تعداد:- ۱۱۰۰ گیارہ سو۔

اہتمام:- ربانی برادران۔

مطبوعہ:- ربانی انٹرپرائزز دہلی۔

قیمت :-



ناشر:-

ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	شمار
	تعارف مرتب، مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی	
۷	مقدمہ۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	۱
۴۸	مختصر سوانح عمری حضرت شیخ الہند قدس سرہ۔ مولانا اصغر حسین	۲
۵۳	مناجات	۳
۵۵	قصائد	۴
۵۷	قصیدہ، مدحیہ در ثنا و منقبت مرشدان والا مقام جناب مولانا محمد قاسم صاحبؒ وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ	۵
۶۵	قصیدہ، مشتمل بر بعض حالات مدرسہ عربیہ اسلامیہ۔ دیوبند	۶
۷۲	قصیدہ، خیر مقدم و تہنیت امیر حبیب اللہ خان، والی افغانستان کے ورود ہند کے موقع پر	۷
۷۹	مراثی و قطعات تاریخی وفات	۸
۸۱	نظم تاریخی بر وفات بحر العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ	۹
۸۶	مرثیہ بر وفات حضرت قطب العالم خاتم الاولیاء والمحدثین فخر الفقہاء والمشائخ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ۔	۱۰
۹۲	قطعہ، تاریخ فارسی بر وفات سید احمد خان سی۔ ایس۔ آئی	۱۱
۹۴	تاریخ انتقال سید احمد در اردو	۱۲
۹۵	قطعہ، تاریخ وفات مولانا قاری حافظ محمد اسماعیل صاحب راندیری	۱۳
۹۷	قطعہ، فارسیہ تاریخ وفات ادیب الکامل جامع الفضائل والکمال جناب مولانا مولوی فضل الرحمٰن صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقوم	۱۴

شمار	مضامین	صفحہ
۱۵	قطعہ، اردو مشتمل بر تاریخ وفات مولانا فضل الرحمٰن صاحب ممدوح الصدر رحمۃ اللہ علیہ	۹۸
۱۶	قطعہ، تاریخِ وفات حضرت تاج العلماء مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ	۹۹
۱۷	قطعہ، تاریخ وفات جناب دیوان محمد یسین مرحوم خادم خاص حضرت قاسم العلوم الخیرات نور اللہ مرقدہ	۱۰۱
۱۸	قطعاتِ تاریخ واقعہ جاں کاہ. (وفات مولوی حکیم سید نصرت حسین مرحوم)	۱۰۳
۱۹	ترجیع بند در مرثیہ حضرت مولانا عبد الرحیم رائے پوری قدس سرہٗ	۱۰۵
۲۰	پُر درد نظم، مشتمل بر مرثیہ و تاریخ وفات جامع العلوم والفنون مولانا غلام رسول مدرس دار العلوم رحمۃ اللہ علیہ	۱۱۲
۲۱	منظومات	۱۱۵
۲۲	القاسم (دیوبند)	۱۱۷
۲۳	نظم تاریخی --- درۂ دانیال میں ترکوں کی فتح عظیم	۱۱۸
۲۴	قعاتِ تاریخ	۱۲۳
۲۵	قطعہ، تاریخ مرمت مسجد حضرت شاہ. بخاری صاحب قدس سرہٗ	۱۲۵
۲۶	قطعہ، تاریخ تعمیر مسجد دار العلوم۔ دیوبند	۱۲۷
۲۷	قطعہ، تاریخ بناء مسجد--- راندیر (ضلع سورت) کی بڑی مسجد کے اختتام کار کا تاریخی قطعہ	۱۳۰
۱۲۸	قطعہ، تاریخ موضع فرقان	۱۳۲

تعارف مرتب محترم مدظلہ

پاکستان کی سرزمین پر مولانا ابو سلمان شاہجہاں پوری مدظلہ کا وجود اکابر دار العلوم دیوبند کی کرامت کا ظہور ہے۔

مولانا محترم اس سرزمین پر اکابر دار العلوم دیوبند اور تحریکِ آزادی کے سرفروش علماء، مولانا ابو الکلام آزاد، حضرت شیخ الہند، حضرت شیخ الاسلام اور مولانا عبید اللہ سندھی علیہم الرحمہ کے شخصی، علمی اور قومی کارناموں کی اشاعت میں مصروف ہیں۔

مولانا آزاد پر مولانا کی متعدد وقیع کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شیخ الاسلامؒ پر مستند اور موثر کتابیں منصہ شہود پر آچکی ہیں۔

مولانا محترم سے میری ملاقات کراچی (اورنگی) میں اس حال میں ہوئی کہ مولانا اپنے برباد شدہ علمی ذخیرہ کو سمیٹنے اور سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے، مولانا کی قیام گاہ پر اینٹی مہاجر عناصر نے سخت حملہ کیا اور مولانا کی تمام رہائش کو تہ و بالا کر دیا۔

مولانا فرما رہے تھے کہ ہجرت کے بعد میں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھکر کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا، ان میں سے یہ کچھ بچی ہیں، کچھ اخبارات کے فائل لوگوں نے راکھ کے ڈھیر میں سے نکال کر مجھے پہنچائے۔

مولانا شاہجہانپوری بڑے مجاہد آدمی ہیں، ایک کالج میں پڑھاتے ہیں معمولی آمدنی ہے، مگر کتابوں کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں، خدا تعالیٰ

غیب سے ان کی مدد کرتا ہے۔

مولانا کا تعلق اب قاری شریف احمد صاحب مالک کتب خانہ رشیدیہ سے قائم ہے اور قاری صاحب سے موصوف کو اس مشن میں بڑی مدد مل رہی ہے. قاری شریف احمد صاحب کا وجود بھی کراچی میں غنیمت ہے۔

قاری صاحب زمانہ طالب علمی کے میرے خاص رفیق ہیں۔ مدرسہ عالیہ فتحپوری میں چھ سال وہ میرے ساتھ رہے۔ چھ سال کے بعد قاری صاحب ڈابھیل چلے گئے اور میں اپنے دوسرے رفیق درس مولانا انظار الدین صاحب کے ساتھ دارالعلوم دیوبند چلا گیا.

مولانا انظار صاحب دماغی مرض میں مبتلا ہو کر گوشہ نشین ہو گئے، مگر قاری صاحب قرآن کریم کا ایک مدرسہ چلا رہے ہیں اور کراچی میں موصوف کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے.

ہم سب ربنائے دارالعلوم مولانا شاہ جہانپوری کے اس مشن پر انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اخلاق حسین قاسمی دہلوی
ادارہ رحمت عالم
شیخ چاند، لال کنواں۔ دہلی ٦
یکم، جون ۹٦ء

مقدمہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی کی ذات گرامی ستودہ صفات اور متنوع کمالات و خصائص کا مجموعہ تھی۔ ان کی نظر نہ صرف دینی علوم و فنون میں گہری تھی بلکہ دنیاوی علوم اور معاملات پر بھی محیط تھی۔ ان کے علم میں رسوخ، عمل میں اخلاص، سیرت میں پختگی، رائے میں اصابت اور ذات میں اعتماد تھا۔ ان کے خیالات میں بلندی اور قلب میں وسعت تھی۔ ان کا سینہ بے کینہ انسانی ہمدردی اور خلق کی بھلائی کے اعلیٰ انسانی جذبات کا گنجینہ اور ان کی زندگی قربانی اور ایثار کا مجموعہ تھی۔

ان خوبیوں نے انھیں نہ صرف مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں بلکہ ہندوستان کی مختلف اقوام میں ایک ممدوح و محبوب شخصیت بنا دیا تھا۔ ان کی شخصیت اور علم و سیرت کی دل فریبیاں اور ذہن و دماغ کی اعلیٰ صفات دیدہ، حسن پرست اور نگاہِ حق بین کو ورطہ، حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو کی کرشمہ سازیاں دامن دل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی اور اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی شخصیت کے ان تمام دامن کشاں پہلوؤں، ان کے علم، فضل اور ذہنی و فکری کمالات کے بے شمار خصائص، دینی و ملی اور قومی و وطنی خدمات کے تمام دوائر کے احاطے اور گزشتہ دورِ علم و تہذیب، تاریخ ملت اسلامیہ، ہند اور تحریک آزادی وطن کی ایک عظیم الشان اور جامع اوصاف، شخصیت کے تذکرے کے لیے کوئی مختصر تحریر کافی نہیں ہو سکتی۔ یہاں حضرت کی جامع حیثیات اور ہمہ صفت شخصیت کی خدمات کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ ایک خاص پہلو

پر اظہار خیال کے لیے بنیاد فراہم ہو جائے اور ان کی جامعیت اور مقام عظمت کا اندازہ لگایا جاسکے؛

۱۔ وہ ایک عالم دین، فقیہہ، بلند پایہ محدث، قرآن حکیم کے مترجم اور مفسر تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس علوم وفنون اسلامی میں بسر ہوا تھا۔ تصنیف وتالیف کے دائرے میں بھی ان کے موضوعات کا زیادہ تعلق انھی علوم وفنون سے تھا۔ اس سلسلے میں ادلہ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القری فی توضیح اوثقی العری، الجھد المقل فی تنزیہ المعز والمذل، حاشیہ مختصر معانی، افادات، تصحیح سنن ابوداؤد، تقریر بخاری وتقریر ترمذی، الابواب والتراجم وغیرہ تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔

آپ کا عظیم الشان مذہبی کارنامہ قرآن حکیم کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کی زبان وبیان کی خوبیوں اور اپنے ادبی خصائص کے علاوہ دعوت وارشاد، اصلاح وتزکیہ اور تعلیمات وارشادات قرآنی کی اشاعت میں اس کی اہمیت کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت کے ترجمہ قرآنی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ترجمہ گروہی اور جماعتی افکار وعقائد اور فقہی اور فرقہ وارانہ اختلافات سے بلند ہو کر کیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ قرآن حکیم کے تمام انسانوں کے لیے ہدایت الہیٰ کا صحیفہ ہونے کا نظارہ آنکھوں سے دکھا دیتا ہے اور قلب سلیم اس مشاہدہ حق کو بے چوں وچرا تسلیم کر لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہند شریعت کے ماہر ہونے کے ساتھ سلوک وطریقت کے رہنما بھی تھے۔ آپ کی توجہ سامی اور تعلیم وتربیت سے سیکڑوں مسلمانوں کے حالات میں انقلاب پیدا ہو گیا تھا، انھیں توبہ وانابت کی توفیق ملی تھی، ان میں عبادت وریاضت کا ذوق پیدا ہوا تھا اور تقویٰ وخشیت الہیٰ کے نور سے ان کی زندگیاں منور ہو گئیں تھیں۔

۲۔ حضرت شیخ الہند کی خدمات کا دوسرا بڑا میدان سیاست ہے۔ وہ ملک کی تحریک

آزادی کے صف اول کے رہنما تھے۔ انھوں نے سیاست کے میدان میں ایثار وقربانی کا الاؤ اس وقت روشن کیا، جب وقت کے بڑے بڑے مدعیان حریت اور رہنمایان آزادی اپنے عہد طفولیت سے بھی نہ نکلے تھے یا کاسہ لیسی کی زندگی جن کا شعار تھا اور آزادی وحریت کے مفہوم سے بھی ان کے ذہن ناآشنا تھے۔

حضرت شیخ الہند نے ترکی، ایران، افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک کے خلاف برطانوی استعمار کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو سب سے پہلے سمجھا، اس کے خلاف ملک میں ایک زبردست محاذ بنایا، ترکی خلافت، اس کی آزادی وخود مختاری کو برٹش استبداد سے بچانے کے لیے دارالعلوم دیوبند کو بند کر دیا اور اساتذہ وطلبہ کے وفود مرتب کر کے انھیں ملک کے دور دراز کے شہروں میں بھیجا اور برطانوی شہنشاہیت کے خلاف ایک زبردست تحریک پیدا کر دی۔ عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار ومنظم کر دیا۔

ملک کی آزادی اور اسلامی ممالک کے تشخص کی بحالی، ان کی خود مختاری کے تحفظ اور ان کی حکومتوں کے استحکام کے لیے حضرت شیخ الہند ایک مستقل نظام فکر رکھتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے پورے ملک میں ایک خفیہ انقلابی تحریک کا جال بچھا دیا تھا۔ ۱۹۱۵ء کے بعد اس کا تعلق دنیا کے انقلابیوں اور استعمار دشمنوں سے قائم ہو گیا تھا۔ اواخر ۱۹۱۵ء میں حضرت کا بیرون ملک کا سفر ان کی اسی سیاسی انقلابی تحریک کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ دیسی اور ملک کے اندر بنی ہوئی اشیا کا استعمال آپ نے اس وقت شروع کیا جب سودیشی کی تحریک کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ برٹش حکومت سے موالات اور تعاون کا ہاتھ حضرت نے اس وقت کھینچ لیا تھا جب رہنمایان کرام ترک موالات اور عدم تعاون کی تراکیب واصطلاحات سے بھی واقف نہ ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی برٹش استعمار کے نزدیک ایک خطرناک شخصیت تھی۔ انھیں ملک کے اندر قید ونظر بند رکھنا بھی حکومت کے مصالح کے خلاف سمجھا گیا تھا۔

چناں چہ ملک سے باہر سیکڑوں میل دور بحیرہ روم کے جزیرے مالٹا میں جس کے چاروں طرف ہزاروں مربع کلو میٹر میں سمندر پھیلا ہوا تھا اور اس سے کسی کے فرار ہو جانے کا کوئی امکان موجود نہ تھا، انتہائی نگہداشت میں انھیں قید رکھا گیا تھا اور جب تک جنگ عظیم اول کے بادل انگلستان کے آسمان سے چھٹ نہیں گئے اور خطرہ بالکل ٹل نہیں گیا، انھیں رہا نہیں کیا گیا اور نہ انھیں وطن آنے کی آزادی ملی۔

۱۹۲۰ء کے وسط میں جب ساڑھے چار سال سے زیادہ عرصے کے بعد حضرت شیخ الہند وطن تشریف لائے تو آخری چھ مہینوں میں زندگی کے آخری لمحوں تک وہ ترکی خلافت کے استحکام، ممالک اسلامیہ و آثار مقدسہ کے تحفظ، ملک کی آزادی کی تحریک اور اس کے لیے مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان خلیج کو پاٹنے اور حریت پسند انقلابی قوتوں اور جماعتوں میں ربط پیدا کرنے، برٹش حکومت کے خلاف انھیں منظم کرنے اور ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد کے قیام کے لیے سرگرم رہے اور جب انھوں نے سفر آخرت اختیار فرمایا تو ملک کے اندر مسلمانوں کے مکاتب فکر میں اور مختلف مذاہب و اقوام میں برٹش استعمار کے خلاف ایک بے مثال اتحاد موجود تھا۔

۳۔ علمی میدان بھی حضرت شیخ الہند کی خدمت گذاریوں سے محروم نہیں رہا لیکن حضرت کے علمی موضوعات کا تعلق چوں کہ مذہبی اور دینی افکار و مسائل اور ان کی تحقیق سے ہے۔ اس کا مختصر ذکر مذہبی خدمات کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ حضرت کے سیاسی افکار و افادات جو حضرت کے خطبات، فتاویٰ، خطوط وغیرہ کی شکل میں منتشر تھے، انھیں خاکسار راقم الحروف نے "شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی --- ایک سیاسی مطالعہ" کے نام سے مرتب کر دیا ہے۔

۴۔ حضرت کی خدمات کا ایک ادبی میدان بھی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں حضرت کی خدمات کے جائزے کی ابھی تک کوئی سنجیدہ کوشش کی ہی نہیں گئی اور جو کوشش کی گئی تو وہ انتہائی ناقص اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ خالص ادبی تحریر

و تصنیف تو کوئی تھی ہی نہیں۔ حضرت کا کچھ منظوم کلام تھا جو مولانا سید اصغر حسین دیو بندی نے ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) میں مرتب کر کے "کلیات شیخ الہند" کے نام سے شائع کروا دیا تھا۔ یہ جمع و ترتیب کی ایک قابل قدر ادبی کاوش تھی۔ لیکن ادبی خصائص اور فنی محاسن کی تلاش میں اس وقت بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے بعد بھی یہ بات اشارات سے آگے نہ بڑھی تھی اور اب تک یہ بات اسی مقام پر ہے۔

خاکسار نے حضرت شیخ الہند کی تمام مذہبی، سیاسی اور نجی تحریرات کی روشنی میں ان کے ادبی خصائص تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر تحریر میں حضرت کے شاعرانہ کلام کے ادبی خصائص اور فنی محاسن کی جستجو کی ایک ابتدائی کوشش کی جا رہی ہے۔

شاعری کا پس منظر

ایک زمانہ تھا کہ علم معانی و بیان نصاب کا ایک حصہ تھا اور اس میں تدریس کے دوران ہی میں اتنی مہارت پیدا ہو جاتی تھی کہ زبان پر قدرت کے ساتھ اوزان و بحور کے علم، عروض و ارکان کی واقفیت، تقطیع کی مشق اور قوافی پر نظر کی بدولت شاعری سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی اور بغیر کسی خاص کاوش کے شعر کہنا آ جاتا تھا۔ اس سے آگے اگر فطرت کسی کے شاعرانہ ذوق کی رہنما اور ماحول سازگار ہو تو شاعری میں مقام اور امتیاز پیدا کر لینا مشکل مرحلہ نہ ہوتا تھا۔

حضرت محمود نے درسیات کی تحصیل کے دوران ہی میں معانی و بیان اور زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ حضرت کے والد مولانا ذوالفقار علی کو ادب سے خاص مناسبت ہی نہیں، شعر گوئی کا بہت عمدہ ذوق بھی تھا۔ شاعرانہ کلام اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کی شرحیں ان کے شاعرانہ کمال اور ادبی تنقیدی ذوق کی یادگار ہیں۔ ان کی صحبت اور فیضان علمی و ادبی کی بدولت ان کے صاحبزادے محمود میں بھی اوائل دور

تعلیم سے شعری وادبی ذوق کے چراغ روشن ہوگئے تھے۔ درسیات کی تکمیل نے جن میں علم معانی وبیان شامل تھے، ان کے ادبی وشعری ذوق کو مزید نکھار دیا تھا۔ حضرت محمود کے ادبی وتنقیدی ذوق کی یادگار "مختصر المعانی" کی شرح ہے۔ زبان وبیان پر عبور، عروض سے کمال واقفیت، اوزان وبحور کی تمیز، قوافی پر نظر اور مدرسے سے گھر تک ماحول کی سازگاری نے ان کے شاعرانہ ذوق کو خوب مجلیٰ کر دیا تھا۔ محمد عبداللہ قاسمی حیدرآبادی نے لکھا ہے:

"حضرت شیخ الہند میں موزونیت طبع، نظم کا شوق، شعر وشاعری کا مذاق ایام طالب علمی ہی سے تھا۔ قدیم اساتذہ اور مستند شعرا مثلاً غالب، ذوق وغیرہ کے صدہا اردو، فارسی اشعار آپ کو ازبر تھے۔" (علماء دیوبند اور اردو ادب، ص ۵۱)

ڈاکٹر اقبال حسن خان نے بھی حضرت کے ابتدائی ماحول اور شاعرانہ ذوق کی تربیت اور ان کے داخلی وخارجی موثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہند کو قدرت نے بڑی فیاضی سے شعر گوئی کا ملکہ ودیعت کیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ادبی تربیت میں آپ کے والد صاحب کے ادبی ریاض کو بڑا دخل رہا ہے۔ نیز خاندانی روایات بھی ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیخ الہند کے والد بزرگ وار مولانا ذوالفقار علی صاحب کو ادبیات کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ ان کے ادبی سرمایے عربی زبان کی معرکتہ الآرا کتابوں کی شرح معانی کی شکل میں موجود ہیں۔ ابو تمام کی حماسہ، دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کی اردو شرحیں ملک کے ارباب علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شیخ الہند نے معانی وبدیع کی مشہور عربی کتاب "مختصر المعانی" کی شرح لکھی، جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

شیخ الہند کی شخصیت کے انھیں داخلی اور خارجی موثرات نے ان کی زندگی میں سوز وگداز پیدا کر دیا تھا، جس کا لازمی نتیجہ انفعال ہوتا ہے اور یہی انفعالی کیفیات جب الفاظ، تعبیر، کنایہ، رمز واستعارے کے پیکر میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو شعر ہو جاتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے شیخ الہند کی شاعری کا مطالعہ ہمیں ان کی داخلیت تک پہنچاتا ہے۔" (شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ حیات اور علمی کارنامے، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء، ص ۱۹۱)

حضرت شیخ الہند کے اعلیٰ شاعرانہ ذوق کی سب سے بڑی اندرونی شہادت تو خود حضرت کا زندہ جاوید کلام ہے۔ بیرونی اور خارجی شہادتوں میں آپ کے تلمیذ رشید، رفیق زنداں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شہادت سے بڑی کوئی شہادت نہیں ہو سکتی، جو برسہا برس تک سفر وحضر میں حضرت کے ساتھ رہے اور سفر حجاز کے دوران میں ۱۹۱۶ء سے حضرت کی وفات تک تقریباً پانچ برس تو حضرت کے ہم ردیف رہے تھے۔ وہ حضرت کے شاعرانہ ذوق ومقام کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

"جب کبھی کسی نے شعر وسخن میں مولانا سے مذاکرہ کیا ہے تو اس قدر اردو، فارسی، عربی کے اشعار اس کو سننے پڑے ہیں کہ اس کو سوائے حیرانی اور کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ قدرت نے موزونیت طبع وہ فرمائی تھی کہ کھرے اور کھوٹے کو خوب پہچانتے اور اس میں تمیز کامل فرماتے تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے اشعار تالیف فرماتے تھے کہ طبقہ علما تو درکنار حذاق شعرا بھی عش عش کر جاتے تھے۔" (سفرنامہ شیخ الہند، اسٹار پریس۔ دہلی، ص ۵)

شاعرانہ مقام:

حضرت کا شاعر ہونا ان کے لیے ہرگز کوئی فضیلت کی بات نہ تھی۔ یہ ان کے سرمایۂ علم وفضل کی کل پونجی نہ تھی۔ ہم انھیں محض شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا نہیں چاہتے، لیکن ان کے ذہن وفکر کے بہت سے خصائص، علم کے بے شمار فضائل، سیرت کے محاسن اور حسن خدمات کے متعدد دوائر کے ساتھ وہ ایک عمدہ شاعر بھی تھے اور مختلف اصناف سخن میں ان کا سرمایۂ کلام یادگار ہے۔ اس لیے ہم نہ اس سے انکار کرتے ہیں اور نہ اس کے تذکرے کے بغیر گزر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وعمل کے بے شمار فضائل سے نوازا تھا۔ سیرت کے بہت سے محاسن سے ان کی شخصیت مزین تھی۔ ذہن وفکر کی بہترین صلاحیتوں کے مالک اور اعلیٰ دماغی اوصاف سے متصف تھے۔ انھیں دین کی تبلیغ واشاعت، علوم وفنون اسلامی کی تدریس، اصلاح وتزکیہ کے مساعی، ملک کی آزادی کی راہ اور قوم وملت اور وطن کی خدمت کے میدان میں قید وبند کی صعوبتوں اور جان ومال اور وقت کے ایثار وقربانی کی توفیق بھی ارزانی ہوئی تھی۔

وہ اگرچہ شاعری میں میر، سودا اور غالب ومومن کے ہم پایہ نہ تھے، لیکن علم وعمل اور ذوق وفکر کے متعدد میدانوں میں، وہ نہ صرف ان سے بلکہ اپنے اقران وامثال میں سب سے بلند وعظیم شخصیت کے مالک تھے۔

حضرت محمود ایک خاص دائرۂ فکر وعمل کی شخصیت تھے۔ یہی ان کی شاعری کے خاص موضوعات تھے۔ شاعر اور اس کے موضوعات سے محبت کرنے والوں کی کثیر تعداد اور وسیع حلقہ ہے۔ ان کا ذوق وفکر ادب وشعر کے انھیں سانچوں میں ڈھلا ہے، جو ان کے ممدوح علیہ الرحمہ نے ان کے سامنے پیش کیے تھے۔ ان کے نزدیک حضرت محمود کا شاعرانہ مقام بہت بلند اور ان کے کلام کے شاعرانہ محاسن بے شمار ہیں۔ اس کا

اعتراف متعدد اہل علم اور اصحاب نظر نے کیا ہے۔

مولانا صادق علی قاسمی لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہند کی شاعری کلام کی پختگی، روانی اور برجستگی کی آئینہ دار ہے۔ گہرائی اور گیرائی کا اعلیٰ شاہکار ہے اور دنیائے شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔"

(حضرت شیخ الہند کی تالیفی وتصنیفی خدمات (مقالہ) مشمولہ "مقام محمود"۔ دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۵)

مولانا جمیل الرحمن قاسمی پرتاب گڑھی لکھتے ہیں:

"آپ کے ان اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کسی بھی استادِ سخن سے پیچھے نہیں ہیں۔ عام شعرا کے یہاں شریعت کی مقررہ حدود کی پابندی اور عقیدے کی سلامتی کوئی ضروری چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن بالغ نظر علمائے امت کے یہاں نثر کے ساتھ نظم میں بھی شریعت کی پابندی ضروری ہے۔

آپ کے جتنے بھی اشعار ہیں، ان میں اس ممتاز وصف کے ساتھ فصاحت وبلاغت اور شکوہ بیان بہ کمال درجہ موجود ہے۔"

(حضرت شیخ الہند کی علمی زندگی (مقالہ) مشمولہ "مقام محمود"، ص ۸۷)

محمد عبد اللہ حیدرآبادی لکھتے ہیں:

"آپ ایک باکمال شاعر ہیں۔ بلند تخیل، لطیف تغزل، عمیق فلسفہ، جذبات کی صداقت اور انداز بیان کی ندرت سے کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ پھر قرآن واحادیث کے مضامین کی طرف لطیف اشارات

اس جان میں روح ایمان پیدا کر دیتے ہیں ۔"

(علماء دیو بند اور اردو ادب، ص ۵۱)

اگر حضرت محمود کے کلام میں صنائع و بدائع اور دیگر محاسن شعری پر بحث کی جائے تو ان کا احاطہ ممکن نہیں ۔ حضرت کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زبان پر بے پناہ عبور حاصل ہے ۔ تاریخ اور علوم و فنون شتی کی اصطلاحات انھیں ازبر ہیں ۔ استعاروں، تشبیہوں اور تلمیحوں کے استعمال میں ان کی غیر معمولی علمی قابلیت اور ادبی و فنی صلاحیت کا اظہار ہوا ہے ۔ عربی زبان کے اقوال، ضرب الامثال، احادیث کے جوامع الکلم اور آیات قرآنی کے بر محل استعمال میں انھیں قدرت حاصل ہے ۔ نوع بہ نوع قوافی سے ان کے مطالعے کی وسعت، ذہن کی دراکی اور قدرت کلام ہی کا پتا نہیں چلتا، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن کو ایجاد و اختراع تراکیب سے خاص مناسبت تھی۔

شاعری کا اسکول:

ڈاکٹر اقبال حسن خان نے حضرت محمود کی شاعری کے اسکول اور اس کی زبان کی ایک خامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان کی شاعری اپنے مزاج، سج دھج اور تیور کے اعتبار سے دبستان دہلی کی پابند اور مقلد نظر آتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ دیو بند کا علمی و ادبی لگاؤ دہلی سے ہے نیز اس کے علاقہ کی جغرافیائی حالت بھی بڑی حد تک دہلی کی تابع ہے ۔ زبان بھی کھڑی اور خاصی پنجاب زدہ ہے ۔" (شیخ الہند مولانا محمود حسن --- حیات اور علمی کارنامے، محولہ بالا، ص ۱۹۱)

قصائد:

قصیدہ ایک جامع اور مکمل صنف ادب ہے ۔ اکابر شعرائے عرب و عجم نے اس صنف میں گراں بہا تجربات کیے ہیں اور شعرائے اردو نے ان کے تتبع کو شعار بناتے ہوئے اسے فن کے درجہ کمال کو پہنچایا۔ قصیدہ دراصل ایسی صنف ہے جس میں آمد سے زیادہ آورد کو دخل ہے ۔ غزل کے اشعار کی طرح اس کے اشعار وجدانی نہیں ہوتے غور و فکر اور ہنرمندی کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ اردو کے قصائد میں دو چار سے زائد ایسے قصیدے نہیں ملیں گے جن کی شان نزول میں بے ساختگی موجود ہو ۔ قصیدے کی ہیئت ترکیبی کا ہر عنصر اپنی جگہ مکمل اور خاص خصوصیات کا حامل ہوتا ہے ۔ تشبیب میں رنگینی بیان، خیال آفرینی اور حسن بیان جیسی خصوصیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے تو مدح میں شوکت الفاظ، غلو اوصاف اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے ہوتے ہیں ۔ قصیدہ جہاں قدرت کلام کا لوہا منوانے کے لیے کہا جاتا تھا، وہاں وہ حصول منفعت کا ذریعہ بھی تھا۔ اس کا ہر شعر صانع کی قدرت کا مظہر ہوتا ہے تو ساتھ ہی ممدوح کی پسند خاطر کا پابند بھی شاعری کو حقیقی جذبات، احساسات اور خیالات کا مجموعہ ہونا چاہیے ۔ عام طور پر قصائد اس صفت سے عاری ہیں ۔

فن کے نقطہ نظر سے حضرت محمود کے کلام میں شامل قصیدے کا جائزہ لیا جائے تو مروجہ لوازم کے ساتھ ان میں ایک شان انفرادیت بھی دکھائی دیتی ہے ۔ ان کا ایک قصیدہ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی شان میں ہے ۔ اس کا آغاز ایسی رنگینی بیان سے نہیں ہوا ہے، جس میں ساقی کے حسن و جمال، موسم کی مستی، جذبات کی ہیجان انگیزی ہو اور طلب شراب ارغوانی کا پر تصنع رسمی بیان ہو ۔ شعر کہنے والے کے ذاتی اور ذہنی رجحانات کا غماز ہوتا ہے ۔ حضرت محمود نے تشبیب انھیں شرائط کے زیر اثر لکھی ہے اور اسلام کے بنیادی عقائد کو موضوع قرار دیا ہے ۔ یہ شاعر اور اس

کے ممدوحین کے اوصاف سے خصوصی مناسبت رکھتے ہیں اور صرف فن کاری کے مظاہرے کے بجائے امورِ حق کے اعادے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرتاں چہ کہتے ہیں:

جب ہوئی رحمت باری ، ہوئے مرسل منزل
اہل عالم کے لیے احمد و قرآں دونوں

رحمتِ حق کے لیے ہیں ، یہی دو اصل اصول
اور ہدایت کے لیے ہیں یہی ارکاں دونوں

قصیدے میں مشکل پسندی ایسی زمین کی متقاضی ہوتی ہے جس میں ہنر آزمائی کرتے ہوئے اچھے اچھے شاعر کا خون پسینہ ہو جائے۔ اس قصیدے کی شان یہ بھی ہے کہ مشکل زمین میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ قافیہ "قرآن" اور ردیف "دونوں" کے ساتھ اچھے شعر اور بہت سارے شعر کہہ جانا فن، بیان اور زبان پر قدرت کاملہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔

گریز کی کیفیت دیکھیے کہ خدا اور رسولؐ کے راستے پر چلانے کے لیے شاعر کو رہنما قوتوں کی ضرورت ہے۔ ان کی روح متلاشی ہے کہ؛

کون سمجھائے ہمیں مطلب اللہ و رسول
کون سکھلائے ہمیں سنت و قرآں دونوں

کون بتلائے ہمیں علم و عمل کی گھاتیں
کون دکھلائے رہ شبلی و نعماں دونوں

گریز کے بعد حضرت محمود مدح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے ممدوح ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ اس اعتبار سے بھی قصیدہ کی منفرد خصوصیت قائم ہوتی ہے۔ دونوں بزرگ یعنی حضرت قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اوصاف حمیدہ اور اعمال حسنہ میں ایک دوسرے کے مثل تھے ان میں کسی ایک کی شان بیان کرنا دوسرے کی شان بیان کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے کہا ہے:

ایک صورت ہے نظر آتے ہیں جس کے دو عکس
اک حقیقت ہے کہ ہیں جس کے یہ عنواں دونوں

دونوں کو دیکھوں تو آتے ہیں نظر ایک مجھے
ایک کو دیکھوں تو ہیں اس میں نمایاں دونوں

کبھی کہتا ہوں کہ اک جان ہیں اور دو قالب
کبھی کہتا ہوں ہیں یک قالب و یک جاں دونوں

مدح میں روایتی انداز سے اجتناب کیا ہے۔ اس میں بعید از قیاس مبالغہ نہیں بلکہ جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں حقیقت کا رنگ ہے البتہ شکوہ الفاظ پوری آب و تاب سے نظر آتا ہے۔ عام قصائد کی طرح اس میں ہم معنی الفاظ کا ہجوم ہے اور نہ لیاقت لفظی کے اظہار کی کوشش، جس سے کلام میں طوالت تو پیدا ہوتی ہے لیکن معنویت محدود ہی رہ جاتی ہے۔ حضرت محمود کا کمال یہ ہے کہ اصول بلاغت کے تحت کم الفاظ میں زیادہ معنوں کو سمویا ہے اور ممدوحین کے اوصاف کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ چوں کہ حضرت محمود اردو ہی کے نہیں فارسی اور عربی کے بھی مستند عالم تھے اسی لیے قصیدے کی شان بڑھانے کے لیے ان زبانوں کے الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ! وہ اپنے تبحر علمی اور طلاقت لسانی کی بنا پر آیت یا حدیث کے حصوں کو شعر میں یوں استعمال کر جاتے ہیں کہ تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ قصیدے میں مدح کا حصہ طویل ہے۔ اس میں کوئی شعر کمزور یا بھرتی کا نہیں۔ شاعر کے خیالات اور احساسات ایک لڑی کے موتیوں کی طرح باہم دگر مربوط ہیں اور قوتِ بیان نے اشعار میں دریا کی روانی پیدا کر دی ہے۔ جس شان و شکوہ سے مدح کی ابتدا ہوئی ہے اختتام تک اس میں فرق نہیں آیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ناسک و معتمر و حافظ و عالم عابد
حامی دین متیں ماحی طغیاں دونوں

کائن و بائن و فانی و صفی و باقی
سالک راہ یقیں عارف یزداں دونوں
عارج و نازل و محبوب و محب و واصل
قطب ارشاد ہیں اور مرکز عرفاں دونوں
ضارب راس عدی فارق حق و باطل
قاسم بزم ہدیٰ جامع فرقاں دونوں
راشد و قاسم خیرات و رشید و مرشد
قبلۂ دیں ہیں اور کعبۂ عرفاں دونوں
خسرو علم و عمل تاجور اہل طریق
مسندِ فقر کے ہیں قیصر و خاقاں دونوں
مظہر فیض اتم مجمع اخلاق و شیم
معدن لطف و کرم مخزن احساں دونوں
بحر مواج طریقت کے ہیں دو چشمۂ فیض
گلبن شرع کے ہیں سنبل و ریحاں دونوں
باغ امداد الہیٰ کے ہیں دو سرو رواں
شمع ہیں نور محمدؐ کی درخشاں دونوں
سرمۂ دیدۂ توحید ہیں سبحان اللہ
عین ایمان و رسالت کے ہیں انساں دونوں
محمل قول نبیؐ کا لمطر لایدری
من یجدد بھم الدین کے شایاں دونوں
وہ تناسب کہ تھا مابین خلیل و خاتم
رکھتے عیسیٰ سے ہیں مہدی دوراں دونوں

شرک و بدعت سے کیا صاف رہ سنت کو
پھر غلط کیا ہے کہ ہیں ناسخ ادیاں دونوں

واقفہ کار جانتے ہیں جن اوصاف اور اعمال کا ذکر مدح میں ہے وہ شاعر کی خیال آرائی پر مبنی نہیں بلکہ ممدوحین کی ذات والا صفات کے حصے ہیں۔ شاعر نے ممدوحین کو اپنے شاعرانہ تصور کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ان کے حقیقی اوصاف کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

اشعار کے طویل سلسلے میں مدح کرنے کے بعد بھی شاعر کو اطمینان خاطر نہ ہوا کہ انھوں نے حق ادا کر دیا ہے۔ اس لیے مطلع ثانی کے بعد بھی بیان کے سلسلے کو جاری رکھا ہے۔ اس حصے میں بھی تشبیب ہے اور بالکل نئے انداز اور رنگ کی۔ شاعر نے روایت سے قریب تر ہوتے ہوئے قدرے رنگینی بیان سے ممدوحین کا سراپا لکھا ہے لیکن کلام کو حدّ اعتدال سے متجاوز نہیں ہونے دیا۔ شاعر سراپا میں حسن و جمال، خط و گیسو، ابرو و تار نظر، لب جاں بخش، مژگاں وغیرہ کی توصیف میں رطب اللسان ہے۔ مضامین عمدہ ہیں جو خیال و بیان کی نفاست و لطافت کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ جیسے؛

نور افشاں ہوں اگر عارض جاناں دونوں
مثل خفاش مہ و مہر ہوں حیراں دونوں
دل و جاں نذر ہیں گر حسن و جمال جاناں
صوری و معنوی ہیں جان کے خواہاں دونوں
گیسو و خط مری نظروں میں سمائے کس کے
خار آتے ہیں نظر سنبل و ریحاں دونوں
دام ایمان و رگ جان کمند وحدت
کیا بتاؤں کہ ہیں کیا گیسو پیچاں دونوں

ہر دو ابرو ہیں پئے شام غریباں دو ہلال
یہ بھی تسلیم کہ ہیں تیغ صفا ہاں دونوں

بخیہ ساز دل مجروح ہیں للہ الحمد
ان کے تار نظر و سوزن مژگاں دونوں

ایک ہی صانع نے ہلالین لکھی مصحف پر
رخ دلکش پہ ہیں ابرو جو نمایاں دونوں

دین و دل کو لب جاں بخش ہیں آب حیواں
کہوں کس منہ سے کہ ہیں لعل بدخشاں دونوں

صدف دل میں گہر ریز ہے اللہ اللہ
الحق اس کے لب جاں بخش ہیں نیساں دونوں

گفتگو چہرہء انور کے مساوات میں ہے
ہم نے مانا کہ مہ و خور بھی ہیں رخشاں دونوں

اُن سے روشن ہے فقط ارض و سما اور اِس سے
دل منور ہوئے اور گور غریباں دونوں

لب شیریں کی وہ تقریر ہے آتے ہیں نظر
بحر شیریں سے نکلتے در و مرجاں دونوں

یاد میں کس کے قد و رخ کے ہیں سرگرم فغاں
بلبل نغمہ سرا قمری نالاں دونوں

فرق اتنا ہے وہ مژگاں کا ہے یہ پیکاں کا
نیم بسمل ہیں مگر گبر و مسلماں دونوں

کشتہء خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہے ایک
لذت وصل ہو یا ہو غم ہجراں دونوں

اس تمنا میں کہ شاید کہیں بن جائیں ایاز
من و محمود شدہ بندہء جاناں دونوں

جس پائے کی مدح سرائی ہے اسی کی مناسبت سے آخری حصہ دعا کا بھی ہے۔ دنیا مقاصد دنیاوی کے حوالے سے نہیں ہے۔ بلکہ روحانی اقدار کی بلندی اور آخرت کے سنوارنے کے خیال کا غلبہ ہے جن کا حصول انھیں نے پیروی میں اور انھیں کی رہنمائی سے ممکن ہے۔ اپنی دعا میں انھوں نے بحر و بر کو بھی شامل کرایا ہے:

بحر و بر میں نمل و حوت ہیں سرگرم دعا
ملاء اسفل و اعلیٰ ہیں ثنا خواں دونوں

جب تلک عالم فانی رہے قائم یارب
اور عالم میں رہیں طاعت و عصیاں دونوں

فیضیاب ان سے رہیں اہل جہاں اور ان پر
روز افزوں ہوں تری رحمت و رضواں دونوں

ان کی الفت میں مروں ان کے غلاموں میں اٹھوں
سینہ صد چاک ہو اور آنکھیں ہوں گریاں دونوں

دل میں ایمان ہو، ایمان میں ہو عشق ان کا
زیب لب عشق میں ہوں نالہ و افغاں دونوں

دل کے سو ٹکڑے ہوں ہر ٹکڑے میں سودا ان کا
جان صد پارہ ہو ہر پارہ میں پنہاں دونوں

حضرت محمود نے قصیدے کو بے جا تشبیہوں اور دور از کار استعاروں سے سنوارنے کے بجائے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ تلمیحوں سے شعری حسن اور معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ روایتی ہیئت ترکیبی سے گریز نہ کرتے ہوئے بھی موضوع اور بیان میں جدت اور ندرت کے کمالات دکھائے ہیں۔ فصاحت و بلاغت بھی حسن

کلام کے اجزا ہیں جن سے ابلاغ کا حق احسن طریقہ سے ادا ہوا ہے۔

حضرت محمود کا دوسرا مہتم بالشان قصیدہ کسی فرد کی شان میں نہیں، بلکہ ایک ایسے ادارے کی توصیف میں ہے جو راہِ مستقیم سے بھٹک کر مادیت اور دہریت کی جانب رواں دواں قوم کی رہنمائی کے لیے افقِ ہند پر روشنی بن کر نمودار ہوا اور جس نے علم کی ضیا پاشیوں سے برصغیر جنوبی ایشیا ہی کو نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کو منور کر دیا۔ اسی مادر علمی کی آغوش علم و تہذیب میں حضرت محمود کی تربیت ہوئی تھی اور پھر اسی مرکز علم و تعلیم میں خود ان کی ذات سے فیوض و برکات کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ یہ مرکز علم و تعلیم دارالعلوم دیوبند کے نام سے موسوم تھا۔ اس سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ اس لیے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں اس قصیدے میں جن باتوں کا ذکر ہے وہ تصنع سے پاک ہیں۔ ان میں ان کے حقیقی اور سچے خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ خلوص دلی اور جذباتِ حقیقی ہی کلام میں اثر و تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے "قصیدہ مشتمل بر بعض حالات مدرسہ، عربیہ، اسلامیہ، دیوبند" کو بھی جذبات قلب و روح کا عکاس قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس قصیدے میں بھی عالمانہ شان موجود ہے۔ ہر حصے میں مضامین کے انبار لگا دیے ہیں۔ فن کے لوازمات کو ملحوظ رکھنے کے باوجود روایتی انداز بیان اور رسمی مضامین سے گریز کیا ہے۔ اس میں نہ ساقی نامہ ہے نہ برشگال میں محفل ناؤ نوش کی لذتوں کا ذکر ہے، نہ دنیا کی رنگینیوں میں کھونے اور عقبیٰ کو فراموش کرنے کی شاعرانہ کوشش ہے۔ جو شعر بھی ہے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا اور تاثر سے مملو ہے۔

قصیدے کے ابتدائی حصے میں فلسفیانہ نقطہ نظر اختیار کرنا موضوع کا تقاضہ تھا۔ دنیا کے حالات اور اپنے تجربات سے حاصل شدہ نتائج کے اظہار کو تشبیب میں شامل کر کے ایک دینی مدرسہ کی تعریف کرنا عالمانہ طریق بیان ہے۔ وہ انقلابات جہاں کو ایک ناقابل تردید حقیقت قرار دیتے ہیں کہ ان میں خوشگوار اور المناک پہلو

توارد کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ اس لیے غم و اندوہ سے احساس شکست و ریخت نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ ان کے جلو میں شادمانیاں اور کامیابیاں بھی ہوتی ہیں۔ شادی و غم جہاں میں توام اور انسانی زندگی کے لوازم میں سے۔ ان سے مفر کی گنجائش نہیں۔ ہر دو حالتوں میں زیست کرنے کا حوصلہ اور ظرف انسان میں موجود ہونا چاہیے۔ زندگی کے اسی فلسفے کی ترجمانی ان اشعار میں کی ہے:

ہیں منن اور محن دونوں، جہاں میں توام
حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم
کھینچ کے لیے بندوں کے ہے اللہ اللہ
عیش و غم کی ید قدرت میں کمندِ محکم

حضرت محمود کے نقطہ نظر سے خوشی اگر لطف و راحت فراہم کرتی ہے تو رنج والم بھی انسان کی سیرت پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے قائد خیر بنا دیتا ہے:

سائق لطف ہے ہر راحت و شادی یاں کی
قائدِ خیر ہے دنیا میں ہر اک رنج و الم

رنج و الم کے جو مابعد اثرات ہوتے ہیں ان کا اس سے بہتر ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتا۔

زندگی نہ تو صرف مسرت و انبساط کا نام ہے اور نہ محض غم و اندوہ کا! دونوں حالتیں اور کیفیتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

یہ یقین کہ غم دینے والے کے پاس خوشی دینے کی قدرت کہیں زیادہ ہے، تقویت ایمان کا باعث بھی ہوتا ہے اور قوت برداشت میں اضافے کا بھی۔ خدا کی قدرت سے مایوس ہونے کے بجائے اس کی جانب سے مسرت انگیز انقلاب کی توقع رکھنا حوصلہ مندی کی علامت ہے اور یہی رجائیت ہے:

رحمت و فضل خدا جب ہے غضب پر سابق
کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں ہم لطف و کرم
اس کی آغوش غضب میں ہیں ہزاروں رحمت
اس کے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف و کرم
فضل سے اس کے کسی وقت نہ ہونا مایوس
خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم

اس کی تفصیل دلنشیں انداز میں بیان ہوئی ہے۔ قصیدے کے یہ اشعار جو اظہارِ قدرت وروانی اور معنویت کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ پائے کے ہیں، ان میں سادہ صاف اور واضح الفاظ میں فلسفہ، تقدیر اور مرضی الہیٰ کی وضاحت کر دی ہے۔ تشبیب سے گریز کا پہلو نکال کر برصغیر پر چھائی ہوئی جہالت کی گھنگھور گھٹاؤں کا ذکر کیا ہے جہاں؛

آبِ حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی
ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی امّیٔ واصم

اور قوم تذبذب کا شکار تھی:

شوق کہتا تھا بڑھو ، ضعف کہے تھا ٹھہرو !
ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دم

ایسے میں ایک مردِ حق پرست، اللہ پر ایمان رکھنے والا اور اسی کی ذات ستودہ صفات پر بھروسا رکھنے والا، مال ودولت اور اسباب دنیاوی سے تہی، علم اور عمل کا خزانہ گراں بہا لے کر آگے بڑھا اور ایک بے نام زمین پر علم کے پرچم اس طرح گاڑ دیے کہ وہ سرزمین علم وعمل کی علامت اور ایک عظیم الشان دینی، ملی اور سیاسی تحریک کا سرچشمہ بن گئی۔ بانی دارالعلوم حضرت قاسم نانوتوی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شان میں بھی قصیدہ خوانی کا حق ادا کیا ہے اور ایک قصیدے کو دو کی مدح کا ذریعہ بنایا ہے۔ تقریباً

بیس اشعار حضرت نانوتوی کی مدح میں ہیں جو بذات خود ایک جداگانہ قصیدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حصہ جوش بیان، شوکتِ الفاظ اور قدرتِ کلام کا شاندار نمونہ ہے اسے اردو کے کسی بھی قصیدے کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ فرق اس میں صرف اتنا ہے کہ بعید از قیاس مضامین اور انتہا کو پہنچے ہوئے مبالغے سے اجتناب کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے نیازی و توکل رخ روشن سے نمود
قطع منزل کے لیے دونوں قدم تیغ دو دم
چہرہ خوب سے انوار تواضع ظاہر
نظر نیک سے آثار غنا مستفہم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفور
پڑ گئی جان میں جان آہی گیا دم میں دم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور
زینہ بام ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی
یک بہ یک چونک پڑے اہل مدر اہل خیم
اس کی آواز تھی یا بانگ خلیل اللہیٰ
کہہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم

تشبیب کے مضامین کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے قیام دارالعلوم اور حضرت نانوتوی کے فیضِ جاریہ پر مسرت وانبساط اور فخر ومباہات کا اظہار کرنے کے بعد مرضی الہیٰ سے حالات کے پلٹا کھانے کا مذکور ہے جو حضرت قاسم العلوم نانوتوی کے سانحہ ارتحال کے نتیجے میں واقع ہوا تھا۔ حضرت محمود نے اس پر صرف چند شعر کہے ہیں جو نفس مضمون سے جدا اور سلسلہ کلام سے خارج نہیں ہیں اور درد وتاثیر سے مملو ہیں۔ اس

حصے میں مرثیہ کا رنگ غالب ہے۔ حضرت کے وصال کے بعد دارالعلوم کے بقا کا جان کاہ مرحلہ درپیش ہوا۔ ایسے میں خیر خواہان ملت کے اصرار پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی بہ مشکل تمام راضی ہوئے اور زمام امور اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ لمحہ تھا گویا:

بھر دیا قلب مقدس میں تمام عالم کا
درد و غم ، خیر و صلاح خوب ملا کر باہم

اس کے بعد طویل سلسلہ حضرت گنگوہی کی مدح کا ہے۔ انھوں نے دارالعلوم کی بقا و ترقی کے لیے جو جو کلفتیں اٹھائیں اور زندگی کے دیگر تمام دنیاوی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر جس طرح رات دن اس کی خدمت کی اس کے لیے یہ اشعار مدح سے زیادہ اعتراف کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس میں انھوں نے نہایت خوبصورت شعر کہے ہیں:

سب کی الفت پہ تھی اس کی ہی محبت غالب
سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم
نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے
فتنہ نے سر نہ اٹھایا کہ ہوا ہو نہ قلم
مردوں کو زندہ کیا زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریم

قصیدہ کا اختتام دعا کے بجاے اظہار تمنا اور اپیل پر کیا ہے۔ اس طور میں بھی جدت طرازی سے کام لیا ہے:

اے اسیران غم قاسم خیر و برکات
اے فقیران سر کوئے رشید جانم
پیروی کرتے رہو سعی کو ہاتھوں سے نہ دو
بدے یا درے یا قدمے یا بقلم

دراصل عنوان تو اس کا۔ قصیدہ مشتمل بر بعض حالات مدرسہ، عربیہ،

اسلامیہ، دیوبند" ہے، یہ امر تحقیق طلب ہے کہ عنوان حضرت محمود کا دیا ہوا ہے یا بعد میں کسی نے عطا کیا ہے، لیکن مروجہ مفہوم میں یہ قصیدہ نہیں ہے۔ اور نہ صرف مدرسہ، عربیہ، اسلامیہ، دیوبند کی تعریف ہی میں ہے۔ بلاشبہ اس کی ہیئت قصیدے کی ہے۔ لیکن موضوع اور بیان کے لحاظ سے اس کو مثنوی کے زمرے میں شامل ہونا چاہیے۔

حضرت محمود نے دارالعلوم کے قیام، حضرت نانوتوی کے سانحہ، ارتحال کے بعد اس پر طاری ہونے والی عدم استحکام کی نوعیت کا حال بیان کیا ہے اور پھر حضرت گنگوہی کے امورِ مدرسہ اپنے ہاتھ میں لینے پر طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے قوم سے تعاون و امداد کی اپیل کی ہے۔ یہ ایک طرح سے دارالعلوم کی ابتدائی تاریخ اور مقاصد کی روداد بھی ہے اور اس میں حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کی حسب موقع ستائش ومدح بھی کی گئی ہے۔ حضرت محمود نے جو تمہید باندھی تھی تمام اشعار اسی کی توضیح مزید کرتے ہیں، انقلابات زمانہ، زندگی کے نشیب و فراز، امید و بیم، ترقی و زوال، اطمینان اور بے اطمینانی کی کیفیات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ دارالعلوم نے بھی کشمکش حیات کے ان ادوار سے گزر کر خدمت علم و دین کی منزلیں طے کرنی شروع کی تھیں۔ ان کا بیان ہی شاعر کا مقصود ہے۔

فارسی قصیدہ۔ خیر مقدم و تہنیت، امیر حبیب اللہ خان:

حضرت کے کلام میں ایک قصیدہ فارسی زبان میں بھی ہے جو امیر افغانستان کے ورود ہند (۰۷۔۱۹۰۶ء) کے موقع پر کہا گیا تھا۔ موجودہ صدی کے ربع اول تک مسلمانان ہند کی نگاہیں اسلامی ریاستوں ترکی اور افغانستان پر لگی ہوئی ہیں۔ جن کی ترقی وخوشحالی کے وہ خواہاں تھے۔ برصغیر کا قریب ترین ہمسایہ افغانستان تھا، اس کے ساتھ دلی وابستگی جہاں بر بنائے رشتہ اخوت اسلامی قائم تھی، وہیں اس کی جنگ جویانہ

فطرت اور اسلام کی خیر خواہی کے لیے اس کے جوش کے مدِ نظر بھی اس سے یہ توقع تھی کہ وہ برصغیر کو انگریزوں کے سامراجی شکنجے سے آزاد کروانے میں مسلمانانِ ہند کی اخلاقی اور مادی امداد فراہم کرے گا۔ اس لیے امیر افغانستان کے لیے خیر سگالی کے جذبات اور عقیدت واحترام سے مسلمانانِ ہند کا دل لبریز تھا۔ ایسے میں ان کی آمد پر جس خوشی کا اظہار کیا گیا وہ ظاہری اور نمائشی نہیں تھا بلکہ خلوص نیت کی بنا پر تھا۔

حضرت مولانا شاہ پرست تھے نہ جاہ پرست، انھوں نے امیر افغانستان کی شان میں قصیدہ لکھا تو یہ طلب منفعت کے لیے نہ تھا اور نہ حصول عزت کے لیے۔ اس لیے یہ قصیدہ بالمشافہ امیر کی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا، بلکہ کسی اور ذریعہ سے امیر موصوف کے حضور پیش کیا گیا تھا۔ اس میں حضرت محمود نے اپنے ہی جذبات پیش نہیں کیے بلکہ مسلمانانِ ہند کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ امیر افغانستان کے لیے فارسی ہی میں قصیدہ لکھنا مناسب تھا کہ وہ ان کی اپنی زبان تھی۔ ساتھ ہی حضرت محمود نے خود اپنی اس مہارت کا اظہار کیا ہے جو اس زبان پر انھیں حاصل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فارسی خوب جانتے تھے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ان کی روزمرہ اور بول چال کی زبان نہیں تھی۔ حسن اظہار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسی زبان میں سوچا جائے جس میں شعر کہے جارہے ہوں۔ عام طور پر لوگ اپنی زبان میں سوچتے اور دوسری زبان میں اظہار کرتے ہیں، یہ تخلیقی عمل نہیں ہوتا بلکہ ذہن تخلیقی عمل سے گزر کر ترجمہ پر مائل ہوتا ہے اور ترجمہ حقیقت نہیں، حقیقت کا پرتو ہوتا ہے۔ برصغیر نے ایسے شاعر بھی پیدا کیے جنھوں نے فارسی میں سوچا اور اسی زبان میں شعر کہے۔ ان میں بیدل اور غالب ناقابل فراموش ہیں۔ حضرت محمود کو بہ اعتبار شعر گوئی اس درجہ پر فائز نہ سمجھا جائے تب بھی ان کی زبان دانی پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی چوں کہ قصیدہ امیر افغانستان کی ہند میں آمد کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ اس کی مناسبت سے ردیف "آمد" رکھی گئی ہے اور مطلع میں اسی کی نوید سنائی گئی ہے۔

فزودہ شوکت اسلام و در روحم رواں آمد
سوے ہندوستاں شاید حبیب اللہ خاں آمد

آنے والے امیر کی خصوصیات مہ اسلامیاں، شہ ایمانیاں، امیر خسرواں، ہنگ بحر، شیر نیستاں، سراج ملت ودین، ظل الٰہی، مہربان برخلق، فدائے رحمت وغیرہ گنائی ہیں۔ نہ تو ان اوصاف میں مبالغہ ہے اور نہ ان کے بیان میں تصنع! سچائی اور حقیقت بیانی اس زمانے کے علم ویقین کے عین مطابق ہے۔

ڈاکٹر اقبال حسن خان نے اشعار کے حوالوں کے ساتھ اسی مرثیے کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے اپنی تحقیقی کتاب میں لکھا ہے کہ اس کے اشعار کو صنعت گری اور فن کی نزاکتوں کے لحاظ سے اردو کے کسی اچھے سے اچھے مرثیے کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔

حمد کے اشعار زیادہ نہیں لیکن شکوہ الفاظ اور شوکت بیان سے مملو ہیں جو زبان پر عبور اور اظہار پر قدرت کے ترجمان ہیں۔

روایت کے برخلاف مدح کے بعد عرض حال کے طور پر "ستمہائے دوستاں" اور "مظالم بیگانگاں" کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوں کہ ان اشعار کا منشا امیر کی خوشنودی ہی نہیں تھا بلکہ انھیں مسلمانانِ عالم کا رہنما مانا جاتا تھا اور وہ مہمان کے طور پر آئے تھے اس لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی جانب سے ترجمانی بھی کی جائے۔ یہ حق قصیدے کے ان حصوں میں ادا کیا گیا ہے۔ حضرت محمود کے دل میں ملت کا سچا درد تھا وہ اس کی بے راہ روی اور جدید فکر سے، جو اسلام کے منافی تھی، سخت برگشتہ تھے اس لیے ان اشعار میں جو کچھ لکھا وہ ان کے دکھے ہوئے دل کی آواز ہے۔ اس وقت آزاد خیال اور تجدد پسندی کی ایسی ہوا چلی تھی کہ اسلام کا سارا نظام عقائد درہم برہم ہو گیا تھا۔ جنت، دوزخ، فرشتہ، شیطان، عذاب، ثواب، وحی، رسالت میں شک وانکار سے لے کر حالت نبوت کے دعوے تک پہنچ چکی تھی۔ عبادات اسلامی کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا تھا، علوم

وفنون اسلامی کو بے اعتبار ولغو قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت محمود نے بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ اس فکری انتشار اور بے راہ روی کا نقشہ کھینچا ہے:

رسالت را کسے منکر، کسے گوید نبی ہستم
کسے از وسط ہند آمد کسے از قادیاں آمد
وجود دوزخ و جنت، ملک جن و قیامت نیز
بسان غول و نابش لغو و باطل پیش شاں آمد
نماز و روزہ و عمرہ، زکوۃ و حج بیت اللہ
بچشم شاں (خدایا کور بادہ) رائیگاں آمد
نزول وحی و معراج و ظہور معجزہ ہیہات
بہ زعم گرہاں افسانہائے پاستاں آمد
حدیث و فقہ و تفسیر و ہمہ احکام شرعیہ
بہ نزد ماکساں بے اعتبار و بے نشاں آمد
علومے را کہ فخر الانبیاء میراث خود گفتہ
زتندی حوادث در بہار او خزاں آمد
علوم دیں کہ تفسیر و حدیث وفقہ شد نامش
چو کالائے زبون و ہیچ کاسد رائیگاں آمد
زقرآں حکم لااکراہ فی الدین یادشاں ماندہ
زاقوال نبی الدین یسر" بر زباں آمد

یہ باتیں کرنے والے اور اعتقاد رکھنے والے مسلمان ہی پیدا ہوئے تھے۔ یہ اعدائے اسلام کی دشمنی نہ تھی، اسلام کے نام لیواؤں کا ستم تھا۔ حضرت محمود کو اس بات کا دکھ تھا اور زبان شکوہ سنج:

ستمہائے کہ کردہ برسر اسلام اعدائش
ہزاراں باز زاں افزوں زناداں دوستاں آمد
من از بیگانگاں ہرگز نمی نالم کہ بر جانم
بلاہائے کہ شد نازل زدست دوستاں آمد
ستمہائے عزیزاں آں چناں زار و زبونم کرد
کہ فریادم شنیدہ غیرو برمن مہرباں آمد

"مظالم بیگانگاں" کے زیر عنوان انگریز حکمرانوں کے ظالمانہ رویے کی مذمت اور حصول آزادی کی تڑپ کا اظہار کیا گیا ہے ساتھ ہی مذہبی تعصب کی ملامت کی ہے۔ ان حالات میں شاعر کی جو روحانی کیفیت تھی اس کا اظہار اس شعر میں کیا ہے:

چہ دنداں در جگر افشردہ باشم از غم وحسرت
چو بینم گلشن اسلام پامال خزاں آمد

قصیدے میں شہر آشوب شامل کر کے حضرت محمود نے اس صنف شاعری میں قابل ستائش اضافہ کیا ہے۔ اس سے حق گوئی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ قصیدے کا اختتام دعا کے ان اشعار پر کیا ہے:

الہیٰ رحمت و فضل تو بروئے باد و بر آتش
چناں کو بر غریباں و رعایا مہرباں آمد
نگہدارش زکید حاسد گندم نما یارب
کہ او حامی علم و دیں دریں دور زماں آمد

قصیدہ الفاظ کے شکوہ، زبان کی متانت، اسلوب کی رنگینی، مضامین کے تنوع اور روایت فن کی پابندی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں صنف کی خصوصیات اور فن کی خوبیاں موجود ہیں۔ حقیقت پسندی کے جذبے سے جو اضافے کیے گئے ہیں وہ قصیدے کی اہمیت اور افادیت میں اضافے کے موجب ہوئے ہیں۔

مرثیہ نگاری:

مرثیہ نگاری میں حضرت کا خاص اسلوب ہے۔اس میں اظہار رنج ہے، غم انگیز جذبات ہیں، قلب گداز کے احساسات ہیں، لیکن رسمی نوحہ گری اور روایتی مرثیہ خوانی اور نالہ وفغاں سے اس کا تعلق نہیں۔ان میں ممدوح اور اصحاب مرثیہ کے احوال ومقامات کا بیان ہے اور حقیقت کے عین مطابق، مبالغے کا اس میں نام نہیں۔ حضرت محمود کے مرثیوں کی یہ خوبی ہے کہ انھیں سامنے رکھ کر ممدوحین کے علمی فضائل، روحانی مقامات، اخلاقی محاسن، سیرت کے خصائص، خدمات دینی وملی، افکار حقّہ کا ایک حقیقی مرقع تیار کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی مرثیوں کے تمام لوازم اور شاعرانہ محاسن بھی ان میں بہ کمال موجود ہیں۔

کلیات میں خاص مرثیے صرف دو ہیں؛

۱- مرثیہ بروفات حضرت قطب العالم خاتم الاولیا والمحدثین فخر الفقہا والمشائخ مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ

۲- ترجیع بند در مرثیہ حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ

مرثیے ہی کے سلسلے میں حضرت کی ان دو نظموں کو بھی شامل کرلینا چاہیے؛

۱- نظم تاریخی بروفات بحرالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

۲- پر درد نظم مشتمل بر مرثیہ وتاریخ وفات جامع العلوم والفنون مولانا غلام رسول مدرس دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ

ان مراثی ومنظومات کے علاوہ متعدد قطعات تاریخ یادگار ہیں۔

۱- اردو اور فارسی میں دو قطعات تاریخ وفات "ادیب کامل جامع

الفضائل والکمال جناب مولانا مولوی فضل الرحمن صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہم" کے ہیں۔

۲- ایک قطعہ، تاریخ وفات "حضرت تاج العلما مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ" پر ہے۔

۳- ایک قطعہ تاریخ مولانا قاری حافظ محمد اسماعیل راندیری کی وفات پر ہے۔

۴- قطعہ، تاریخ وفات جناب دیوان محمد یٰسین صاحب مرحوم خادم خاص حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہ

۵- دو "قطعات تاریخ واقعہ، جاں کاہ" کے عنوان سے حضرت محمود کے مرید باصفا اور عقیدت کیش با اخلاص رفیق اسارت مالٹا مولوی حکیم سید نصرت حسین کے انتقال پر ملال پر یادگار ہیں۔

۶- فارسی اور اردو میں دو قطعات تاریخ وفات جنھیں قطعات کے بجاے منظومات کہنا چاہیے، سرسید احمد خان کے انتقال کی یادگار ہیں۔لیکن یہ تعزیتی قطعات نہیں بلکہ صرف قطعات تاریخ ہیں۔ان میں ان کے بعض عقائد کارد اور عقائد واعمال کے بعض تضادات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

تمام مرثیے، تعزیتی نظمیں اور قطعات تاریخ رنج وغم کے اظہار، سوز وگداز کے بیان، محامد ومحاسن کے اعتراف، حقائق سے سرمو عدم تفاوت، مبالغے کے عیب سے منزگی میں اپنی مثال آپ ہیں۔زبان پر حضرت کی دسترس، بیان پر قدرت اور اسلوب کی دل نشینی میں اپنا جواب آپ ہیں۔ان کے ادبی محاسن کا اظہار ان کے تمام اشعار سے ہوتا ہے۔ان کے مطالعے سے تاریخ گوئی میں بھی حضرت کے کمال کا پتا چلتا ہے۔

اردو میں مرثیہ ایک جامع صنف سخن کی حیثیت سے مروج ہے۔ اساتذہ، سلف خصوصاً میر انیس اور میر دبیر نے اسے درجۂ کمال تک پہنچایا۔ مرثیہ کی روایت واقعۂ کربلا کے اذکار سے زندہ ہے۔ شخصی مرثیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر حضرت محمود کا مرثیہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ظاہری اعتبار سے یہ قصیدے کی ہیئت ہی ہے۔ حضرت گنگوہی کی رحلت کے الم ناک واقعے کی رعایت سے تمہید میں نیرنگی زمانہ اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ ایک ناقابل تردید صداقت ہے کہ زمانے کے کروٹ بدلنے سے حالات وواقعات کی نہج تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ناپائیداری بھی ایک ابدی سچائی ہے۔ ہر ذی روح کو ہست سے نیست کا سفر کرنا ہے۔ اسی لیے کہا ہے:

زمانہ میں ہوا جو کچھ فنا ہونا ضروری ہے
زمانہ اور بقا توبہ! زمانہ تو ہے خود فانی
یہ نیرنگی حوادث کی جب اپنا گل کھلاتی ہے
بنے گورِ غریباں دم کے دم میں صحن بستانی

مولانا محمود نے حضرت گنگوہی کی رحلت کو انھیں انقلابات زمانہ کا حصہ قرار دیتے ہوئے اپنے رنج وغم واندوہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مسائل حیات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ہزاروں مصائب سے گزرنا ہے۔ ان میں کوئی نہ کوئی مصیبت ایسی ضرور ہوتی ہے جس کا دل پر سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے اس حقیقت حال کے پیش نظر شاعر نے کہا:

ہم اپنی جان کے دشمن نہیں پر کیا علاج اس کا
غموں کی جان مضطر پر غضب کی ہے فراوانی
ہزاروں غم ہیں دنیا میں بتائیں نام کس کس کا
غم مرشد ہے پر مرشد غموں کا ہے یہ وجدانی

خبر بھی ہے کہ اس جان جہاں نے ہم سے منہ موڑا
کوئی بے وجہ ہم اپنے ہوئے ہیں دشمن جانی
نہ ہو صبح وطن کیوں کر بتر شام غریباں سے
فراق دلربا میں گھر ہے رشک کنج زندانی
خبر ہے جان کو دل کی نہ دل کو جان کی پروا
فقط سینہ پہ ہے ہاتھ اور زانو پر ہے پیشانی

اس تمہید کا رشتہ خبر سے یوں جوڑا ہے:

جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہے ہے
پھریں ہیں ڈھونڈتے سرگشتگان تیہ سیمانی
جنید و شبلی ثانی ابو مسعود انصاری
رشید ملت و دیں، غوث اعظم، قطب ربانی

اسی کے ساتھ واقعے کی اندرونی کیفیت کا اظہار ہے۔ جس میں جذبات دلی شامل ہیں۔ یہاں بھی شعر آفرینی نے بیان میں حسن وحزن دونوں پیدا کر دیے ہیں اگرچہ رقت موجود نہیں ہے۔ اس حصے کے چند اثر انگیز اشعار ملاحظہ ہوں:

نکل کر کس نے آبادی سے صحرا کو کیا مسکن
چمن ہے دشت اور گھر میں ہے ویرانی سی ویرانی
وہ صحرا دیکھنے سے جس کے گھر یاد آہی جاتا تھا
اب اس کو یاد دلواتی ہے میرے گھر کی ویرانی
کہاں لوٹیں کہاں تڑپیں کہاں دل کھول کر روئیں
جگر خوں کرتی ہے دار فنا کی تنگ میدانی
کف افسوس ملنے کی نہ ہو ہاتھوں کو جب مہلت
کریں کا ہے سے پھر زخم جگر کی ہم نگہرانی

ہجوم رنج و غم جوش بکا کی حد نہیں ، اب ہم
سراپا دل بنیں یا چشم ، ہے یہ سخت حیرانی

مرشد کی جدائی کے غم کو بھلانے کے لیے شاعر نے ضروری خیال کیا کہ بیان کو فضائل کے لیے وقف کر دے ۔چناں چہ مرثیے کا حصہ حضرت گنگوہی کی توصیف وستائش اور ان کے فضائل ومحاسن اور شریعت وطریقت میں ان کے مقام عظمت ورفعت کے تذکرے کے لیے وقف کر دیا ہے ۔جسے "غزل مدحیہ" کا نام دیا گیا ہے ۔یہ محاسن شعری کے اعتبار سے قصیدہ ہے جو متانت، سنجیدگی، اعتدال پسندی، صداقت شعاری اور حق گوئی کا حسین مرقع ہے ۔مرشد کے اوصاف کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس سے توصیف کا پہلو نکلتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس دور اور اس مکتبِ فکر کے بزرگوں کے صفات ذاتی میں عظمتِ انسانی کے ایسے پہلو موجود ہوتے تھے کہ ان کا عام بیان بھی مداحی قرار پائے گا۔فضائل کے اعتبار سے انداز بیان اور ضرورتِ شعری کے لحاظ سے شوکتِ الفاظ نے اس غزل کو اعلیٰ پائے کا قصیدہ بنا دیا ہے ۔جس میں اذکار بربنائے صداقت ہیں ۔مبالغے یا قیاس کا کہیں غلبہ نہیں ہے ۔دیکھیے کیسے کیسے معرکہ آرا شعر نکالے ہیں:

وہ تھے کبریت ایمانی ، وہ تھے یاقوت روحانی
ہے کیا کبریت احمر اور کیا یاقوت رمانی
خدا ان کا مربی وہ مربی تھے خلائق کے
مرے مولا مرے ہادی تھے بے شک شیخ ربانی
فقیہ با خبر ایسا کوئی یارو بتائے تو
ہو جس کا علم اذعانی ہو جس کا حکم ایقانی
رخ زیبا ہو جس کا مظہر اوعی من السامع
محدث ایسا دیکھیں گے کہاں اے وائے حرمانی

مفسر ایسا لائیں گے کہاں سے یا خدا جس کے
ہوں قول و فعل دونوں کاشفِ اسرار قرآنی
گدایان در دولت کے کشکول و مرقع سے
نظر آتے تھے شرمندہ قبا و تاج سلطانی
پھریں تھے کعبہ میں بھی پوچھتے گنگوہ کا رستہ
جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوق و شوق عرفانی

مرثیہ کا اختتام بھی جدت کا حامل ہے ۔مرشد کی رحلت پر دوسروں کو تسکین پہنچانے کے ساتھ خود اپنے دل کی تسکین کے لیے یہ نیا پہلو بیان کیا ہے کہ صاحبان رشد وہدایت کے چلے جانے پر اس قدر رنج و غم کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ان کی ذات کی نسبت ان کی ہدایت اہم ہے وہ شاہراہ حیات میں ہمیشہ رہنما ہو گی ۔وہ جدا ہوئے ہیں تو اس میں بھی ایک خیر کا پہلو ہے ۔انھوں نے ہماری مغفرت کا سامان کرنے کے لیے ہم سے پہلے عالم بالا کا سفر اختیار کیا ہے ۔صبر کی تلقین کا اس سے بہتر انداز ممکن نہیں ۔فرماتے ہیں:

عزیزو فکر کیا ہے کس لیے مایوس بیٹھے ہو
وہ سالارِ طبیباں ہے دوائے دردِ حرمانی
تہی دستو نہ گھبراؤ نہ شرماؤ ادھر آؤ !
وہ نیسان کرم اب بھی ہے سرگرم در افشانی
ہدایت کے لیے آئے تھے یاں ، پاکر فراغت اب
گئے ہیں تاکریں واں مغفرت کی میر سامانی

آخر میں اپنی تمنا کا اظہار کیا ہے کہ اسی عالم فراق میں دنیا سے سدھاریں:

طفیل مرشدِ عالم رشید الدین والملت
نکل جائے غم فرقت میں دم بانورِ ایمانی

مرثیہ بے حد طویل ہے اسی اعتبار سے قوافی کی کثرت ہے۔ لیکن کہیں تصنّع کا شائبہ نہیں ہوتا، نہ کوئی قافیہ محض برائے بیت ہے اور نہ بیان کی روانی میں حائل ہوتا ہے۔ ہر قافیہ پر معنی ہے اور اس سے شاعر کے بلند شعری ذوق، ذہن کی خلاقی اور الفاظ پر اس کی گرفت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ نیز تصوف کی اصطلاحات، عمدہ تراکیب وامثال، تشبیہات واستعارات، تلمیحات اور صنائع وبدائع کے حسن استعمال سے زبان وادب، تاریخ ومذہب، مختلف علوم وفنون اور تصوف وسلوک میں حضرت کی گہری نظر اور ذوق کی مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرثیہ کے مروجہ مقصد سے قطع نظر انھوں نے اشعار کو دلی جذبات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا ہے اور یہی صداقت شعاری اشعار میں تاثیر اور کلام کی زندگی جاوید کی ضامن ہوتی ہے۔

حضرت محمود کا دوسرا مرثیہ حضرت عبدالرحیم رائے پوری کی وفات پر کہا گیا تھا یہ مروجہ ہیئت یعنی مسدّس میں ہے عام طور پر مراثی مسدّس ترکیب بند ہوتے۔ یہ مرثیہ ترجیع بند ہے۔ اس کا شعر ترجیع ہے۔

زینت و زیب الف ثانی مرد   شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

فنی اور معنوی اعتبار سے یہ حضرت گنگوہی کے مرثیہ سے کم نہیں ہے۔ یہ چھوٹی بحر میں ہے جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ایسی بحور میں لفظی اور معنوی سقم کے بغیر سلسلہ، بیان کو موثر اور جامع طور پر استعمال کرنا از حد مشکل ہوتا ہے۔ حضرت محمود کے اس مرثیے میں روانی اور بے ساختگی ان کے دیگر کلام کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ تمہید کے طور پر صرف ایک بند ہے جس میں حضرت عبدالرحیم کی رحلت کی خبر دی گئی ہے اور دوسرے بند سے ان کے فضائل کا بیان شروع ہو گیا ہے۔ ابتدائی گیارہ بندوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اردو کے حروف عطف، کوئی فعل، بلکہ فعل مجہول تک نہیں ہیں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے اردو کلام کے زمرے میں شامل بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں، باوجود اس

لسانی خصوصیت کے غرابت کا احساس نہیں ہوتا اور پڑھتے ہوئے معنی بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ہر بند سے ممدوح کی شخصیت کے متعدد پہلو سامنے آتے ہیں، ہر لفظ صفاتِ ذات کا ترجمان ہے۔ بطورِ نمونہ چند بند ملاحظہ ہوں:

رہنمائے مسالکِ ایماں   رہگرائے منازل ایقاں
رہ نوردِ مراحل احساں   ساقی بزم وحدت و عرفان
زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

نورِ چشم اکابر و اعلام   ملجا و مامن خواص و عوام
سرپرست مدارس اسلام   مردم دیدہء رشید انام
زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

راس صلحا و سید علما   رونق افزائے حلقہء فقرا
مسند آرائے محفل عرفا   شمع وہاج مجلس غربا
زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

مدح کے بعد گیارھویں شعر ہی سے رنج وافسوس کا اظہار شروع ہو جاتا ہے جو نہایت غم انگیز ہے چند بند تو انتہائی جذباتی انداز میں کہے گئے ہیں۔ جیسے:

ہمرہ ہمرہان واویلا   ہمرو ہمروان واویلا
ہمدم ہمدمان واویلا   ہمدو دوستان واویلا
زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

باغ امید میں خزاں افسوس   خاک میں گنج شایگاں افسوس

مرگ اور عیسیٰ زماں افسوس	سرد ہو شمع خاوراں افسوس

زینت و زیب الف ثانی مرد

شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

اس مرثیے کی نمایاں خوبی یہی ہے کہ بندوں کی کثرت کے باوجود خیال کے تسلسل اور بیان کی قدرت میں ذرا بھی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ہر بند نئے الفاظ، نئی تراکیب، نوع بہ نوع استعارات اور مانوس تلمیحات سے مزین اور تکرار لفظی یا اعادہ خیال سے یکسر خالی ہے۔غم واندوہ کے مضامین اس انداز میں ادا کرنا اسی شاعر کے لیے ممکن ہے جس کا قلب لذت آشنائے درد ہو اور روح کی کسک شدید۔ وہ اسے پوری طرح محسوس کرتا ہو، ہر زاویے سے اس کے ادراک کی صلاحیت اور ان سچے جذبات کو مناسب الفاظ میں بیان کرنے کا شعور اور ملکہ رکھتا ہو۔

عام طور پر ترجیع بند کے آخری دو مصرعے برائے بیت ہوتے ہیں اور بند کے مطالب سے واضح ربط نہیں رکھتے۔ حضرت محمود نے اکثر بندوں میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ان مصرعوں کی موجودگی لازم قرار پاتی ہے۔ مثلاً؛

ہوئے عثمان جامع قرآں	وہ بدہ تم تھے قاسم فرقاں
تم بلاشک تھے نائب عثماں	آج سنسان کیوں نہ ہو میداں

زینت و زیب الف ثانی مرد

شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

آئی ہے جن بحار میں کو خبر	تلخ ہی وہ رہیں گے تا محشر
احمر ابیض ہیں غم میں سب اخضر	موجیں کہتی ہیں سمجھے کوئی اگر

زینت و زیب الف ثانی مرد

شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

سر پر اس کوہ کو اٹھاتا کون	گردن اس کے لیے جھکاتا کون

دل کے اندر اسے بٹھاتا کون	پڑھ کے یہ روتا اور رلاتا کون

زینت و زیب الف ثانی مرد

شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

اس طرح ہر بند کا چوتھا مصرع بعد کے دونوں مصرعوں کا نقیب بن گیا ہے اور شعر ترجیع کا جواز پیدا ہو گیا ہے۔

ان دونوں مراثی میں صنف کے تمام لوازم کی تلاش بے سود ہے۔ یہ مرثیہ نگاری کی قدرت کے اظہار کے لیے نہیں لکھے گئے۔ روایت کی سر تا سر پابندی نہیں کی گئی۔ مرثیہ کا جو بنیادی مقصد ہوتا ہے اس کو ملحوظ رکھا گیا یا بچھڑنے والوں کے فضائل کو یاد کرنا اور اشعار میں انھیں اس طرح بیان کرنا کہ سیرت نگاری کا حق ادا ہو جائے اور جو لوگ ان بزرگوں کے فضائل سے ناواقف ہوں ان کے علم میں یہ تمام باتیں آجائیں۔ دوسرا مقصد رحلت پر اپنے جذبات قلب وروح کا اظہار کرنا ہے۔ اس کے ذریعے شاعر اپنے تعلق خاطر کا اظہار بھی کرتا ہے، انھیں بیان کر کے دل کے بوجھ کو کم کرتا ہے اور ایک اعلیٰ تہذیبی اور ادبی روایت کی پاسداری کا ثبوت بھی دیتا ہے۔

ان معنوی خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر دونوں مرثیوں کا مطالعہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت محمود نے شعر گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ رہی لفظی خوبیاں تو حضرت محمود جیسے ادیب، فصیح و بلیغ عالم، عربی، فارسی اور اردو پر کامل دستگاہ رکھنے والے اور حسن بیان کے رموز سے آشنا کے لیے وہ الفاظ کہاں سے لائیں۔ جن سے اس کے شاعرانہ مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تعریف وتوصیف کا حق ادا کیا جاسکے۔

حضرت محمود کے کلیات میں متعدد مختصر تعزیتی نظمیں بھی ہیں۔ لیکن ان کی طوالت مرثیے کی حد تک نہیں پہنچتی، نہ نوعیت کے لحاظ سے یہ مرثیہ ہیں، بلکہ مرثیے کے معیار پر انھیں جانچنے کے بجائے انھیں "مادہ، تاریخ وفات" کے ضمن میں رکھنا چاہیے اور ان میں "مادہ تاریخ" کی کیفیت وندرت کو دیکھنا چاہیے۔ اس میں ضروری

ہوتا ہے کہ "مادہ" مرحوم کی شخصیت یا واقعہ، رحلت سے میل کھائے ۔ اسی سے قطعات تاریخ وفات کی عمدگی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ باقی اشعار میں مرحوم کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں یا ان کی رحلت پر اظہار غم کیا جاتا ہے ۔ اختصار کی وجہ سے اس نوع کے مضامین تشنہ ہی محسوس ہوتے ہیں ۔ حضرت محمود کے لکھے ہوئے قطعات تاریخ وفات میں صرف "نظم تاریخی بروفات بحر العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی" طویل ہے، جس میں دنیا کی بے ثباتی اور اپنے غم واندوہ کا مرثیہ کے انداز میں بیان ہوا ہے ۔ دیگر تمام قطعات مختصر ہیں جو صرف "مادہ" کی جامعیت اور اس کے بیان کی ندرت کو ظاہر کرتے ہیں ۔

ایک تاریخی نظم:

حضرت محمود نے درہ دانیال میں ترکوں کی فتح عظیم کی خوشی میں جو "نظم تاریخی" لکھی ہے وہ ان کے کلام میں سچے جذبات کے بے تکلف اظہار کے حوالے سے نہایت شاندار اور منفرد ہے ۔ اس کے ہر شعر سے جذبات مسرت وانبساط جھلک رہے ہیں ۔ بیاں میں خوشگوار کیفیت اور حد درجہ بے ساختگی ہے ۔ نظم کی ابتدا کیا ہے اعدا اور اشقیا کو دعوت مبارزت ہے یا ان کی ناکامیوں اور شکستوں پر اظہار شادمانی ۔ ان اشعار کے تیور دیکھنے کے لائق ہیں:

"بے تکلف آئیں سب اعدا کو دعوت عام ہے
کچھ نہ پوچھو کس قدر بہتا ہے خوان در دنیل
ہم نے یہ مانا نہیں ہیں گو عزیز و مہرباں
لندن و پیرس مگر ہیں میہمان در دنیل
ہر پیاسے کو پلایا جام لبریز اجل
آفریں صد آفریں اے ساقیان در دنیل

بس ہوئی ایسی کہ بس کہنے کو بھی مہلت نہ دی
مرحبا صد مرحبا اے میزبان در دنیل
مست ہوئے ایسے قیامت ہی کو اب آئیں گے ہوش
اللہ اللہ کون ہے پیر مغان در دنیل

عالم سرخوشی میں حضرت محمود کے قلم میں شوخی آگئی ہے اور ایسے ایسے اشعار قرطاس ابیض پر منتقل ہوگئے ہیں:

خر جو پیتا خمر ہے ، سمجھو لگے چینٹی کے پر
اس کو سمجھے گا جو ہو گا راز دان در دنیل
کیا سمجھ کر آئے تھے بتلا تو دو ہم کو مگر
سمجھے تھے خالہ کا گھر اپنی ، مکان در دنیل

نظم ہئیت ظاہری میں قصیدہ ہے ، ابتدا میں دول یورپ کی سپاہ کی شکست وبربادی پر ان کی ہجو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں ترکی جانبازوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے ۔ اس حصے میں قصیدے کی شان جلوہ گر ہے ۔ معرکوں میں مسلمانوں کی کامیابی کی خوشی نے اس میں گونا اضافہ کر دیا ہے ۔ حسن بیان کا اندازہ ان چند اشعار سے ہو سکتا ہے:

بحر اسود احمر اور احمر جو تھا اسود ہوا
کس غضب آفت کی تھی سیف و سنان در دنیل
ہے وہی ہل من مزید اور ہو چکے کفار ختم
قعر دوزخ ہے الہیٰ یا دہان در دنیل
کجروی پاؤں میں ، دل میں آرزو ، سر میں غرور
کاٹ ڈالے کیا بلا تھی تیغ بران در دنیل
کفر لرزے ہے دل کفار میں کہتے ہیں جب
نعرہ اللہ اکبر غازیان در دنیل

آخری نظر:

حضرت محمود نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

دو قصیدے ہیں، کئی مرثیے ہیں، متعدد تعزیتی نظمیں اور قطعات تاریخ وفات، بعض مساجد کی تعمیر وتزئین کے قطعات اور تاریخی واقعات میں نظمیں مثلاً؛ ایک نظم درہ داہیال میں ترکوں کے ہاتھوں دول متحدہ کی فوجوں کی شکست فاش کے واقعے پر اور ایک نظم ماہنامہ القاسم (دیوبند) کے اجرا کی تقریب سے یادگار ہے۔

حضرت کی کوئی مستقل اور الگ غزل نہیں، لیکن ایک غزل مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شان ومنقبت کے قصیدے کی تشبیب میں اور ایک غزل مولانا گنگوہی کے مرثیے میں ہے۔ ان دونوں غزلوں میں غزل کی زبان، الفاظ، تراکیب مثلاً؛ ابرو، بلال، تیغ صفاہان، لب شیریں وجاں بخش، صدف دل، چہرہ انور، مہ وخورشید، قدورخ، بلبل نغمہ سرا وقمری نالاں، لذت وصل، غم ہجراں، بندہ جاناں وغیرہ غزل کی عام تراکیب اور مروجہ مضامین اور تشبیہات واستعارات، تلمیحات کو نہایت عمدگی، شگفتگی، برجستگی اور لطافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ نیز غزل کے اسلوب کو بہت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

حضرت محمود کا کلام اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یادگار ہے۔ اردو تو بے شبہ حضرت کی مادری زبان تھی اور اس میں قدرت کلام ہونا کوئی حیرت کی بات نہ تھی لیکن فارسی ان کی تحصیلی زبان تھی، اس میں مہارت اور قدرت کلام واقعتاً ایک کمال کی بات ہے اور فارسی میں طویل مرثیہ ونظم اور قطعات نگاری میں حضرت کا کمال شعر گوئی ایسا نہیں کہ اس کی تحسین نہ کی جائے۔

اردو شاعری کے ضمن میں حضرت کی طلاقت زبان، قدرت بیان، فصاحت وبلاغت کے کمال اور صنائع وبدائع کے حسن استعمال کے جن شاعرانہ خصائص ومحاسن کا ذکر کیا ہے، وہ تمام کے تمام حضرت کے فارسی کلام میں بھی موجود ہیں۔

الحمد للہ علیٰ احسانہ کہ

کلیاتِ شیخ الہند رح

جسمیں

حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے مختصر سوانح عمری اور آپ کا تمام منظوم کلام قصائد مدحیہ مراثی وتاریخات وفاتِ بزرگان حالات دار العلوم پُرجوش نظم اور مالٹا کے دو خطوط جمع کر دیے گئے ہیں۔

بتالیف

فقیر اصغر حسین عفی عنہ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۰ ہجری میں

باانتظام مولانا عماد الدین صاحب انصاری ناظم مطبع

باہتمام مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی عم فیضہ

مطبع قاسمی دیوبند میں طبع ہوئی

کتبہ نذیر الدین قریشی

قیمت باختلاف کاغذ ۱۲ ر ۲ ؍ ۳ر

کلیاتِ شیخ الہند اشاعتِ اول (۱۳۴۰ھ) کا سرورق

مختصر سوانح عمری حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند قدس سرہٗ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب (جو قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے عثمانی شیوخ میں ایک معزز و ذی وجاہت عالم تھے) بصیغۂ ملازمت ڈپٹی انسپکٹری مدارس ایک عرصہ تک بریلی میں مقیم رہے۔ حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ میں بریلی میں تولد ہوئے اور والد ماجد کا تبادلہ میرٹھ ہو جانے پر غدر کے زمانہ میں ایام طفولیت میں کبھی میرٹھ اور کبھی دیوبند رہے۔ قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کی تعلیم ایک دیندار بزرگ میانجی منگلوری صاحب سے پائی اور کتب عربیہ اپنے با فضل و کمال چچا مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھنی شروع کی تہذیب و قدوری وغیرہ پڑھتے تھے کہ دیوبند میں با اخلاص مقدس بزرگوں کے مشورہ سے ۱۲۸۳ ہجری میں مدرسہ عربیہ (جو آج ایک مرکزی دار العلوم الاسلامیہ ہونیکی حیثیت رکھتا ہے) جاری ہوا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس کے سرپرست قرار پائے۔ حضرت مولانا اسکے سب سے پہلے شاگرد اور طالب علموں میں داخل ہوئے اور اکثر کتب درسیہ یہاں پڑھنے کے بعد اپنے مخصوص استاذ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دیوبند اور میرٹھ میں پڑھ کر صحاح ستہ اور دیگر علوم کی اعلیٰ کتابیں پڑھکر فیوض و کمالات حاصل فرمائے اور بعض کتب اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں۔ فراغت تحصیل سے پہلے ہی مدرسہ میں بطور معین المدرسین درس دینا شروع فرما دیا ۱۲۹۰ھ میں آپ کو علمائے حقانی کے ہاتھ سے دستار فضیلت اور سند تکمیل عطا ہوئی۔ صاحب بصیرت بزرگوں کی تجویز سے ۱۲۹۲ھ میں باقاعدہ مدرس چہارم مقرر ہوئے اور ہر قسم کی متوسط و اعلیٰ کتب کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۲۹۴ھ میں بزرگان ہندوستان کے مشہور قافلہ میں (جسمیں مولانا محمد قاسم مولانا محمد یعقوب مولانا رشید احمد صاحبان اور بہت سے مقدس مشاہیر علماء و صلحاء شریک تھے) حج بیت اللہ اور زیارت حرم نبوی کے شوق میں روانہ ہوئے اور ان مقامات کے فیوض سے مشرف ہو کر چھ ماہ کے بعد بعافیت واپس ہوئے اور بدستور تعلیم علوم میں مصروف اور حضرت استاد و مرشد مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں مشغول ہوئے اسی زمانہ میں اپنی مشہور محققانہ کتاب ایضاح الادلہ کے ابتدائی اجزاء تحریر فرمائے۔

۱۲۹۷ھ میں مولانا محمد قاسم صاحب کی وفات کے غم و رنج میں تمام تعلقات و تعلیم و تعلم ترک کر کے عزلت گزینی اختیار فرمائی مگر ایک ماہ کے بعد مقدس مہتمم دار العلوم مولانا رفیع الدین صاحب کے ارشاد و اصرار سے تعلیم شروع فرمائی جامع کمالات بمنزلہ سلف صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی وفات اور مولانا سید احمد صاحب کے تشریف لیجانے کے

بعد ۱۳۰۵ھ میں حضرت مولانا باتفاق آراء صدر مدرس تجویز ہوئے اور علی الاتصال چالیس سال تک نشر و اشاعت علوم فرماتے رہے۔ تمام علوم اسلامیہ اور ان کے متعلق و تابع فنون میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور سب علوم کی کتابیں بلا تکلف اعلیٰ تحقیقات کے ساتھ پڑھاتے تھے لیکن علم حدیث میں مخصوص شہرت اور بے مثل تبحر رکھتے تھے جسکی وجہ سے اقطار ہندوستان اور ممالک بعیدہ سے طالبان علوم کھنچکر آجاتے تھے۔ مکہ مدینہ موصل بصرہ بلخ بخارا ہرات قندھار کابل ہر جگہ کے طلبہ آپکے حلقہ درس میں نظر آتے تھے اور تحقیقات عجیبہ کے فیوض سے دامن بھر لیجاتے تھے متعدد منتہی طلبہ جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں سے استفادہ کرنیکے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اپنے شکوک و شبہات کے کامل تشفی بخش جواب پانیکے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی و مضامین عالیہ سنکر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے تھے کہ یہ علم کسبی نہیں اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں۔ آواز صاف و بلند۔ تقریر نہایت سلیس و رواں تھی۔ کلام میں خاص اثر تھا جو مضمون کو سامع کے دلنشین کر دیتا تھا۔ جوانی اور قوت کے زمانہ میں دن رات کے اکثر اوقات درس و تدریس کے شغل میں گذرتے تھے لیکن اخیر ایام میں صرف دو تین گھنٹہ روزانہ سنن ترمذی و بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔

عرصۂ دراز سے دوبارہ زیارت حرمین شریفین کا خیال لگا ہوا تھا مگر ۱۳۳۳ھ میں یہ داعیہ اور شوق ترقی پذیر ہوا اور آپ نے ارادہ فرما ہی دیا۔ باوجود اخفاء ارادہ اہل اسلام میں شہرت ہو گئی کہ حضرت ہجرت کا قصد فرما رہے ہیں استفسار و مہمان زیارت و دیدار کے لئے حاضر ہونے لگے اور ہجوم خلائق رہنے لگا دار العلوم کے منتظمین و مدرسین کو نصائح اور وصایا فرما کر اور ضروری امور کے متعلق ہدایات کر کے آخر شوال ۱۳۳۳ھ کو دیوبند سے روانہ ہو گئے۔ دہلی تک صدہا لوگ ہمراہ گئے۔ دو تین گھنٹہ اسٹیشن پر قیام فرما کر بمبئی روانہ ہوئے وہاں پہنچکر چوتھے روز مع اپنے رفقا کے جہاز میں سوار ہو گئے اور بعافیت و صحت مکہ معظمہ پہنچکر زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور تمام رفقا نے حج و عمرہ ادا فرمایا اور بعد فراغت حج مدینہ منورہ تشریف لیگئے۔ جہاں آپکے مخصوص شاگرد مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدرس حرم محترم نبوی نے شایان شان استقبال کیا۔ مولانا ممدوح کے مکان پر بہ عزت و احترام قیام فرمایا بخاری شریف کا درس جاری ہوا جسمیں خود مولانا حسین احمد صاحب اور انکے تلامذہ اور معزز اہل علم مدینہ منورہ و دیگر حضرات شریک درس ہوتے تھے۔ مولانا عربی میں تقریر فرماتے تھے۔ چونکہ بغاوت اور جنگ شروع ہونیکی خبریں آرہی تھیں اسلئے حج کے راستے بند ہو جانیکے اندیشہ سے چھ ماہ کے بعد بہ نیت ادائے حج کا قصد فرما کر مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ چلے۔ مولانا حسین احمد اور ان کے بھتیجے مولوی وحید احمد صاحب خدمت کیلئے ہمراہ ہوئے اور ایک مختصر قافلہ میں بماہ شعبان مکہ معظمہ پہنچے۔ اس مقدس شہر میں چونکہ گرمی نہایت شدت سے پڑتی تھی اور گرانی بھی غیر معمولی تھی ایام حج میں چار ماہ کی دیر خیال کر کے چند روز قیام کرنیکے ارادہ سے مع رفقاء طائف تشریف لے گئے انہیں ایام میں

ترکوں سے جنگ بغاوت شروع کر کے شریف صاحب نے طائف کا شدید محاصرہ کر لیا اور محصور لوگوں پر آب و دانہ بند کر دیا۔ حضرت مولانا نے شعبان و رمضان میں دیگر محصورین کی طرح نہایت تکلیف و عسرت برداشت کی۔ شدت خوف سے جب اندیشہ جان کا ہوا تو شرعاً ضروری سمجھ کر محاصرہ سے نکلنے کی عمدہ تدبیر کر کے کامیاب ہو گئے اور صحیح و سالم ماہ شوال میں مکہ معظمہ پہنچ گئے اور ایام حج کا انتظار کرتے رہے ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں تیسرا حج ادا فرمایا اور مشاغل حقہ میں مصروف رہنے لگے۔ بخاری شریف کا درس ہوتا تھا اور اہل سعادت ظاہری و باطنی فیوض حاصل فرما رہے تھے کہ شریف صاحب کی بغاوت کو برحق ثابت کرنے اور ترکوں کے کفر و تفسیق کا حکم دینے کیلئے ایک استفتا پیش ہوا۔ حضرت مولانا نے کمال حقانیت سے بلا خوف عواقب تصدیق سے انکار فرمایا۔ شریف صاحب کے دل میں عناد و بغض پیدا ہو گیا اور اپنی حکومت کے لئے ان مقدس حضرات (حضرت اور رفقا) کو خطرناک سمجھنے لگے انہیں ایام میں سرکار برطانیہ نے ہندوستان میں تحقیقات و تجسس جاری کرنے کے بعد حضرت مولانا کو اپنا مجرم سمجھ کر شریف صاحب سے طلب کیا وہ تو خود ہی چاہتے تھے فوراً بادشاہی احکام کے بعد باوجود مہذب اور قابل قبول سفارشوں کے حضرت مولانا کو مع رفقا نظر بند کر کے جدہ بھیجا اور وہاں سے جہاز میں قاہرہ لا کر اسیر کئے گئے قید تنہائی کی ایذائیں پہنچائی گئیں اور نہایت اہتمام سے کئی مرتبہ سب حضرات کے اظہار بیان لئے گئے مگر ہر ایک کو وہ تہمات و استقلال ثابت ہوا تین ماہ کے بعد غیر معلوم مصالح کی بناء پر منتقل کر کے جزیرہ مالٹا کے قلعہ میں بھیج دیئے گئے جہاں ترکی اور جرمنی وغیرہ معزز افسران اسیران جنگ نظر بند تھے کچھ وظیفہ نقد اور روٹی روزانہ ملتی تھی۔ یہاں بہت سہولت اور راحت میسر تھی مکان بھی آرام دہ تھا ایک ہر دو مسجد کے طریق پر خاص کر لیا تھا جس میں باجماعت نماز پڑھتے اور دوسرے مسلمان اسیر بھی آ کر شریک ہو جاتے تھے۔ تمام اسیران قلعہ حضرت مولانا کے عقیدتمند اور آپ کے زہد و تقویٰ حسن سیرت کے قائل تھے۔ بہت سے معزز لوگ حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور حضرت کے فیوض ملک بعید تک پہنچے۔ نہایت صبر و سکون و تسلیم و رضا کیساتھ تین سال اور زندان میں گذارے آپ کے رفیق سفر مولوی حکیم نصرت حسین صاحب نے وہیں وفات پائی اور سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کے بنائے ہوئے مقبرہ مالٹا میں مدفون ہوئے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اسی اسیری میں حضرت مولانا نے قرآن مجید کا ترجمہ تمام فرمایا اور بخاری شریف کے ابواب تراجم کے متعلق اپنی تحقیقات عجیب اور مضامین عالیہ کو بطور یادداشت سلیس اردو میں تحریر فرمانا شروع کیا۔ مختلف اوقات میں رہائی کی خبروں اور بار بار کی افواہوں کے بعد ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ میں روانگی کی اطلاع پہنچی اور تاریخ مقررہ پر اسکندریہ پہنچا دیئے گئے۔ دو روز کے بعد وہاں سے براہ ریل سویز پہنچائے گئے۔ سویز میں بانتظار جہاز نہایت تکلیف اور دقت کے ساتھ [illegible] ماہ گذار کر [illegible] رمضان کو جہاز میں سوار ہو کر بطرف بمبئی روانہ ہوئے۔ عدن پہنچ کر آپ کے خادم و رفیق خاص مولانا حسین احمد صاحب نے ہندوستان کو بذریعہ تار تشریف آوری کا مژدہ پہنچایا۔ اور ۸ جون تک بمبئی پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ اہل اسلام میں عموماً اور اہل دیوبند میں خصوصاً

ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی تار اور خطوط کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ تمام ہندوستان میں اطلاع پہنچ گئی مختلف مقامات ہندوستان سے صدہا معتقد و مخلص اور قومی لیڈر تاریخ مقررہ پر بمبئی پہنچ گئے اور دیوبند سے اہل دار العلوم اور حضرت کے عزیز و اقارب کی ایک جماعت حاضر بمبئی ہو گئی اور حضرت مولانا نے نہایت پرشوکت استقبال کیساتھ جس میں مولانا عبدالباری صاحب مولوی شوکت علی صاحب مسٹر گاندھی صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ مشاہیر موجود تھے ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ہجری (۸ جون ۱۹۲۰ء) کو سرزمین ہندوستان پر قدم رکھا۔

باوجود اہل بمبئی کے اصرار کے صرف دو ہی روز قیام فرما کر وطن کی طرف روانہ ہو گئے اور ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو بوقت صبح آٹھ بجے دہلی پہنچے۔ متوسلین دار العلوم اور دیگر اہل دیوبند کی کثیر جماعت اور ہزارہا اہل دہلی اور مختلف مقامات کے مشتاقین زیارت مہمان پلیٹ فارم پر موجود تھے حقیقی عظمت سے بھرے ہوئے پرجوش نعروں اور سلام و مصافحہ کے شدید ازدحام سے بدشواری تمام فارغ ہو کر ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر ایک روز قیام فرمایا اور اگلے روز علی الصباح روانہ دیوبند ہوئے راستے میں تمام اسٹیشنوں پر خلوق خداوندی کا ازدحام تھا اور حضرت مولانا خود تکلیف برداشت کر کے حتی الوسع سلام و مصافحہ کا لوگوں کو موقع دیتے تھے۔ ۲۵ رمضان المبارک کو بوقت چاشت دیوبند پہنچے عظیم الشان مجمع نے استقبال کیا اور براہ راست اپنے مرشد و استاد کی یادگار دار العلوم میں پہنچے اور آبدیدہ ہو کر بیٹھے تمام مجمع کے ساتھ دعائے خیر فرمائی۔ صدہا مہمانوں کی آمد روزانہ شروع ہو گئی اور عظیم ترین مجمع سے اسلامی جلسوں کی یکشان نمایاں تھی ہر روز مجمع نظر آنے لگا۔ شوال کے دوسرے ہفتہ میں آپ مرحوم مولوی نصرت حسین صاحب کی والدہ ماجدہ کے پاس بطور تعزیت جانے کے قصد سے سفر فرمایا اور لکھنؤ کانپور الہ آباد غازیپور وغیرہ میں تشریف لے گئے۔ گھر میں اہلیہ صاحبہ کی سخت علالت کی خبر سے جلد واپس دیوبند آ گئے اور ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو حضرت کی [illegible] وفات ہو گئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انکی وفات کے بعد حضرت مولانا ڈیڑھ ماہ صحیح و تندرست رہے اور ماہ محرم ۱۳۳۹ھ میں عارضہ بخار و پیچش وغیرہ مریض ہو گئے اور درمیان میں کئی مرتبہ حالت خطرناک ہو جانے کے بعد آخر محرم میں [illegible] افاقہ ہو گیا اور بظاہر صحت ہو گئی لیکن ایک ہی ہفتہ کے بعد پھر مرض نے عود کیا اور باوجود اہتمام علاج کے افاقہ نہ ہوا تو حضرات دہلی کے اصرار پر وہاں تشریف لے گئے ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی میں قیام فرمایا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب، حکیم جمیل الدین صاحب نے مخلصانہ اور شاہانہ معالجات کئے لیکن وقت آ چکا تھا دو شنبہ کو لرزہ بخار شدید چڑھا اور ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ روز سہ شنبہ دن کو آٹھ بجے تین مرتبہ اللہ اللہ پکار کر کہا اور خود اپنا بدن سیدھا اور درست کر کے لیٹ جانے کے بعد روح مقدس جنت کو پرواز کر گئی۔ غسل و کفن کے بعد تابوت ریل میں رکھ کر جنازہ دیوبند لایا گیا اور اگلے روز صبح کو مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کے مزار کے قریب یہ آفتاب علوم و کمالات عالم ظاہر سے پوشیدہ ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○

حضرت مولانا نے کوئی اولاد ذکر یادگار نہیں چھوڑی۔ تین لڑکیاں اور نواسے وغیرہ موجود ہیں اور اولاد روحانی ہزارہا شاگرد اور مرید و معتقد ہیں جنکی اصلاح و تربیت میں عمر بسر فرمائی ہے۔ تصانیف عالمانہ و محققانہ آپکی مثل ایضاح الادلہ و احسن القریٰ و جہد المقل وغیرہ عرصہ دراز سے مطبوع ہو کر شائع و مشتہر ہو چکی ہیں۔ البتہ منظوم کلام آپکا مختلف کتب و رسائل میں متفرق جگہ منتشر ہے اور بعض اجزاء کے ابتک طبع ہونیکی نوبت بھی نہیں آئی اسلئے بہ نظر تحفظ اسکی جمع و ترتیب کو حضرت استاذ نور اللہ مرقدہٗ کی ایک ادنیٰ خدمت سمجھکر اور اپنے لئے یادگار و ذخیرہ آخرت خیال کر کے خاکسار فقیر اصغر حسین دیوبندی نے ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ میں بلا خیال کسی خاص ترتیب کے جمع کر کے طبع کرایا ہے۔ واللہ الموفق والمعین ؎

مناجات

سب مراتب ہیں تری ذات مقدس سے ورے
کس زباں سے کہوں ہے مرتبہ اعلیٰ تیرا

نورِ خورشید چمکتا ہے ہر اک ذرہ میں
چشم بینا ہو تو ہر شے میں ہے جلوہ تیرا

بیم دوزخ ہے اُسے اور نہ شوقِ جنت
جس کو مطلوب ہے اک دردکا ذرہ تیرا

تیرے دیوانوں کو کیا قیدِ علائق سے گزند
دونوں عالم سے بھی آزاد ہے بردا تیرا

دل صد پارہ و ہر پارہ میں ہو داغ جنوں
نام کندہ ہو ہر اک داغ پہ مولا تیرا

نفس و ابلیس کے پھندے میں پھنسا ہوں لیکن
دل سے اقرار ہی ہے کہ ہوں بندہ تیرا

ہم سیہ بخت اگر ایسے ہی ناکام رہے
کیسے جانیں گے کہ کیا فضل ہے ربا تیرا

ماخذ: حیات شیخ الہند از میاں سید اصغر حسین

بندہ۔ غلام، قیدی

قصائد

قصیدہ مدحیہ در ثنا و منقبت

مرشدان والا مقام جناب مولانا محمد قاسم صاحب و حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما

یکے از بانیانِ دار العلوم دیوبند قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی عالم، محدث، فقیہ، مناظر، مصنف و ادیب، مجاہد وطن جامع جہات اور جامع صفات شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں قصبہ نانوتہ (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔ نانوتہ، دیوبند، سہارن پور اور دہلی میں تعلیم کے ادنیٰ و اعلیٰ مراحل طے کیے۔ دہلی میں مولانا مملوک العلی، شاہ عبد الغنی مجددی وغیرہما سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ تصنیف و تالیف، درس و تدریس، تبلیغ و ارشاد، اصلاح و اجرائے مدارس دینیہ میں آپ کی خدمات حد شمار سے زیادہ ہیں۔ وہ بہت بڑے سیاسی مدبر اور مجاہدِ تحریکِ آزادی تھے۔ آپ کا بہت بڑا کارنامہ دار العلوم دیوبند کے قیام و تنظیم میں آپ کا حصہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی انقلابی تحریک کا احیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تعلیم و تربیتِ دینی و سیاسی ہے۔ دیوبندی مسلک کے لیے علمی و دینی بنیادیں آپ نے فراہم کیں اور اسے ایک مستقل دینی و سیاسی مکتبہ فکر بنا دیا۔ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۸۸۰ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی پر نوٹ حضرتؒ کے مرثیے کے ساتھ ہے۔

(ا۔ س۔ خ)

جب ہوئی رحمتِ باری ہوئے مرسل منزل — اہلِ عالم کے لیے احمد و قرآں دونوں

رحمتِ حق کے لیے ہیں یہی دو اصلِ اصول — اور ہدایت کے لیے ہیں یہی ارکاں دونوں

پر نہ ہوں سائق و قائد جو رشید و قاسم — ہم کو کیوں کر ملیں یہ نعمتِ یزداں دونوں

کون سمجھائے ہمیں مطلبِ اللہ و رسول — کون سکھلائے ہمیں سنت و قرآں دونوں

کون بتلائے ہمیں علم و عمل کی گھاتیں — کون دکھلائے رہِ شبلی و نعماں دونوں

یہ بہارِ چمنِ دیں ہے انھی کے دم سے — طوطی و زاغ ہیں آپس میں غزل خواں دونوں

ان کے ہی فیض سے شاداب ہیں اور بارآور — علم و اخلاق کے پژمردہ گلستاں دونوں

ظلمتِ جہل گئی علم میں پھر جان آئی — شمسِ اسلام ہیں اور چشمۂ حیواں دونوں

ناسک و معتمر و حافظ و عالم عابد — حامئ دینِ متیں ماحیِ طغیاں دونوں

کائن و بائن و فانی و صفی و باقی — سالکِ راہِ یقیں عارفِ یزداں دونوں

عارج و نازل و محبوب و محبؒ و واصل — قطبِ ارشاد ہیں اور مرکزِ عرفاں دونوں

ضاربِ راس عدی فارقِ حق و باطل — قاسمِ بزمِ ہدیٰ جامعِ فرقاں دونوں

راشد و قاسمِ خیرات و رشید و مرشد — قبلۂ دیں ہیں اور کعبۂ عرفاں دونوں

خسروِ علم و عمل تاجورِ اہلِ طریق — مسندِ فقر کے ہیں قیصر و خاقاں دونوں

مظہرِ فیضِ اتم مجمعِ اخلاق و شیم — معدنِ لطف و کرم مخزنِ احساں دونوں

بحرِ مواجِ طریقت کے ہیں دو چشمۂ فیض — گلبنِ شرع کے ہیں سنبل و ریحاں دونوں

باغِ امدادِ الٰہی کے ہیں دو سرو رواں — شمع ہیں نورِ محمد کی درخشاں دونوں

سرمۂ دیدۂ توحید ہیں سبحان اللہ — عینِ ایمان و رسالت کے ہیں انساں دونوں

محملِ قولِ نبیؐ کا المطر لا یدری — من یجدد بھم الدین کے شایاں دونوں

وہ تناسب کہ تھا مابین خلیلؑ و خاتم — رکھتے عیسیٰؑ سے ہیں مہدیِ دوراں دونوں

شرک و بدعت سے کیا صاف رہِ سنت کو — پھر غلط کیا ہے کہ ہیں ناسخِ ادیاں دونوں

سامریانِ زمانہ سے بچایا دیں کو
میں تو کہتا ہوں کہ ہیں موسیٰ و عمراں دونوں

لطف و فیض اُن کا وہ ہے جس کے اُمیدوار سے
ہیں تردد میں عجب عاصی و شیطاں دونوں

نظرِ مہر و غضب اُن کی وہ ہے جس کو بغور
تکتے رہتے ہیں سدا مالک و رضواں دونوں

دلِ مردہ کے لیے صحبت و خدمت ان کی
قمِ عیسیٰ سے نہیں کم کسی عنواں دونوں

ہمنشیں چھوڑ مساوات یہ ہی دو بینی
مجکو آتے ہیں نظر ایک مری جاں دونوں

میں نہ تفضیل کا قائل نہ مساوات کا ہاں
مجھ سے گمرہ کی ہدایت کو ہیں یکساں دونوں

مرے ہادی مرے مرشد مرے ماویٰ ملجا
مرے آقا مرے مولیٰ مرے سلطاں دونوں

زہے قسمت ہوا کیا خوب قران السعدین
برجِ خاکی میں بہم ہیں مہِ تاباں دونوں

ان میں جو ربط ہے ہم نے تو نہ دیکھا نہ سنا
دونوں دلدادہ ہیں اور دلبر و جاناں دونوں

فرقدین اور ندیمین جذیمہ دیکھیں
اتحاد ان کا تو ہوں ششدر و حیراں دونوں

قربِ جسمانی پہ ہے اُن کے تعلق کا مدار
قربِ روحانی سے یہ یک دل و یک جاں دونوں

ایک صورت ہے نظر آتے ہیں جس کے دو عکس
اِک حقیقت ہے کہ ہیں جس کے یہ عنواں دونوں

دونوں کو دیکھوں تو آتے ہیں نظر ایک مجھے
ایک کو دیکھوں تو ہیں اُس میں نمایاں دونوں

جب تلک ایک بھی باقی ہے سمجھتا ہوں کہ ہیں
کار فرمائے ہدیٰ زینتِ گیہاں دونوں

جب کسی دل میں جگہ کرتے ہیں تو دونوں ساتھ
اور نکلتے ہیں تو نکلیں ہیں بدنیساں دونوں

عشق کا ذکر ہی کیا بغض و عداوت اُن کی
جو نسے دل میں ہیں۔ ہیں توام و چپاں دونوں

کبھی کہتا ہوں کہ اک جان ہیں اور دو قالب
کبھی کہتا ہوں ہیں یک قالب و یک جاں دونوں

کبھی کہتا ہوں کہ ہیں منظرِ اسماء و صفات
کبھی کہتا ہوں کہ ہیں مظہرِ جاناں دونوں

سلسلہ ان کے کمالات کا جب طے نہ ہوا
تھک کے کہنا پڑا آخر کہ ہیں یکساں دونوں

سب کمال ان میں ہیں کس کس کو بتاؤں لیکن
بے مثل ہوتے اگر ہوتے نہ یکساں دونوں

بحرِ زخار ہیں لیکن نہیں ساحل کا پتہ
ابرِ رحمت ہیں مگر ہیں گہر افشاں دونوں

مرہمِ خستہ دلاں ہیں یہ مسلّم لیکن
زخمِ دل پر ہیں مرے کیوں گہر افشاں دونوں

بغض فی اللہ سے ہیں قہرِ خدائے قہّار
حُبِّ فی اللہ سے ہیں رحمتِ رحماں دونوں

اِن کے صدقہ سے غریبوں کے مطالب اغراض
سہل و دشوار خدا نے کیے آساں دونوں

برومندی تمنا میں تردّد نہ رہا
کشتِ مطلب کے لیے جس کے ہیں دہقاں دونوں

غرقِ گردابِ بلا کے لیے دونوں الیاس
گمشدہ رہ کے لیے خضرِ بیاباں دونوں

غلبۂ شوق میں باقی نہ رہا ضبطِ نفس!
لب تلک آتے ہیں لو نالہ و افغاں دونوں

نور افشاں ہوں اگر عارضِ جاناں دونوں (مطلع)
مثل خفّاش مہ و مہر ہوں حیراں دونوں

دل و جاں نذر ہیں گر حسن و جمالِ جاناں
صوری و معنوی ہیں جان کے خواہاں دونوں

گیسو و خط مری نظروں میں سمائے کس کے
خار آتے ہیں نظر سنبل و ریحاں دونوں

دامِ ایمان و رگِ جان کمندِ وحدت
کیا بتاؤں کہ ہیں کیا گیسوِ پیچاں دونوں

ہر دو ابرو ہیں پئے شامِ غریباں دو ہلال
یہ بھی تسلیم کہ ہیں تیغِ صفاہاں دونوں

بخیہ سازِ دلِ مجروح ہیں للہ الحمد
ان کے تارِ نظر و سوزنِ مژگاں دونوں

کیا ہی صانع نے ہلالین لکھی مصحف پر
رخِ دلکش پہ ہیں ابرو جو نمایاں دونوں

دین و دل کو لبِ جاں بخش ہیں آبِ حیواں
کہوں کس منہ سے کہ ہیں لعلِ بدخشاں دونوں

صدفِ دل میں گہر ریز ہے اللہ اللہ
الحق اُس کے لبِ جاں بخش ہیں نیساں دونوں

گفتگو چہرۂ انور کے مساوات میں ہے
ہم نے مانا کہ مہ و خور بھی ہیں رخشاں دونوں

اُن سے روشن ہے فقط ارض و سما اور اس سے
دلِ منوّر ہوئے اور گورِ غریباں دونوں

لبِ شیریں کی وہ تقریر ہے آتے ہیں نظر
بحرِ شیریں سے نکلتے دُرّ و مرجاں دونوں

یاد میں کس کے قد و رخ کے ہیں سرگرمِ فغاں
بلبلِ نغمہ سرا قمریِ نالاں دونوں

فرق اتنا ہے وہ مژگاں کا ہے یہ پیکاں کا
نیم بسمل ہیں مگر گبر و مسلماں دونوں

کشتۂ خنجرِ تسلیم کے کشتوں کو ہے ایک
لذتِ وصل ہو یا ہو غمِ ہجراں دونوں

اُس کی محفل میں ہیں یوں بیٹھے ہوئے دل اور ہم
جیسے ہم بزم ہوں دوا اور پشیماں دونوں

اس تمنا میں کہ شاید کہیں بن جائیں ایاز
من د محمود شدہ بندۂ جاناں دونوں

چھوڑ اندازِ غزل خوانی کہ ہے جائے ادب
مدح کر مدح کہ ہیں مدح کے شایاں دونوں

ان کا یہ عز و عُلیٰ اور مرا یہ عجز و قصور
ناطقہ کے لیے ہیں حاجبِ درباں دونوں

سر بزانوئے تحیّر ہیں خیال و ادراک
خامہ و ناطقہ ہیں سر بگریباں دونوں

اس لیے میں ہیں لکھوں کیا خاک کہ صدیق و ذہین
بیٹھے ہیں ہاتھ دھرے زیر زنخداں دونوں

موردِ سے ہائے غضب احمد و عبدالرحمٰن
ہوئے ہیں طالبِ توصیفِ سلیماں دونوں

مرے محسن مرے مخلص مرے مخدوم و مطاع
رنج افزائے دل و خاطرِ ویراں دونوں

قاسم خیر و رشید احمدِ ذی شاں دونوں (مطلع)
ہیں مسیحائے زماں یوسفِ کنعاں دونوں

باغِ تسلیم و رضا کے گلِ خنداں دونوں (〃)
گلشنِ قدس کے ہیں مرغِ خوش الحاں دونوں

ان سے راضی ہے خدا وہ ہیں خدا سے راضی
کیوں نہ قربان کروں اُن پہ دل و جاں دونوں

بحرِ توحید و معارف کے نہنگ و خوں خوار
دشتِ تجرید کے ہیں شیرِ نیستاں دونوں

فیض و رحمت کے لیے دونوں سحاب و میزاب
علم و حکمت کے لیے نبع و میزاں دونوں

بن گئے اِن کے تصدّق سے مقامِ محمود
کیوں نہ نانوتہ و گنگوہ ہوں نازاں دونوں

فخرِ دیں حجتِ اسلام محی السّنۃ
معدنِ علم و حِکَم ثانیِ لقماں دونوں!

کچھ حقیقت کے لیے راعی و چوپاں ہی نہیں
ہیں شریعت کے اولی الامر و جہانباں دونوں

بھاڑ میں حکمتِ یوناں کو ڈالو دیکھو
مل گئے پیش روِ حکمتِ ایماں دونوں

کھایا سقراط نے سَم خُم میں چھپا افلاطوں
ان کی آمد کا مگر رکھتے تھے اذعاں دونوں

سُن لیں مقتولوں سے گر ذکرِ شجاعت ان کا
الاماں کہنے لگیں سام و نریماں دونوں

پرتو افگن ہو اگر ان کا وقار و عظمت
قطب بن جائیں ابھی نیرِ تاباں دونوں

عمل و علم میں کامل جو نظر پڑتے ہیں
سامنے ان کے ہیں اک طفلِ دبستاں دونوں

اہلِ اشراق کو تشبیہ میں اِن سے دیتا
ایک ہو سکتے اگر دیو و سلیماں دونوں

وائے نادان لکھوں مدح میں اُن کی جن کو
مادح و ذام نظر آتے ہوں یکساں دونوں

وائے ناکامی اگر ہوں نہ عیاذاً باللہ
روزِ محشر میں مرے حال کے پرساں دونوں

غرقِ اموالِ معاصی ہوں نہیں شکلِ نجات
ناخدا ہوں مری کشتی کے مگر ہاں دونوں

علم رکھتا ہوں سو بے سود عمل ہیں سو خراب
دل و جاں رکھتا ہوں لیکن ہیں پریشاں دونوں

جز تہی دستی و یاس اور نہیں کوئی رفیق
مونس و یار ہیں بس حسرت و ارماں دونوں

مجھ کو غفلت سے ہے نسیان تو نسیان سے سہو
حیف کس درجہ بڑھے غفلت و نسیاں دونوں

دیکھ کر اُن کی نظر ہم سے سیہ کاروں پر
نفس و ابلیس ہیں انگشت بدنداں دونوں

میر ساماں ہیں دو گرچہ ہوں میں بے ساماں
نیم جاں گرچہ ہوں رکھتا ہوں مگر جاں دونوں

ان سے نسبت ہے، مجھے نسبتِ قالب مقلوب
ان کی رفعت مری پستی ہوئی یکساں دونوں

ہیں وہ خورشید تو میں ذرّہ وہ ہیں عین میں ظل
ایک قطرہ ہوں جو ہیں قلزم و عمّاں دونوں

فخر کو میرے یہ کافی ہے ہوں اتنا ناقص
کہ ہیں جس درجہ کے کامل مرے سلطاں دونوں

ہے نہانخانۂ دل گرچہ خراب و خستہ
جلوہ فرما ہیں مگر اس میں یہ مہماں دونوں

تیرہ روزی پہ نہ جاؤ مری دیکھو تو سہی
میرے ویرانہ میں ہیں شمعِ شبستاں دونوں

گمرہی سے نہ ڈرو قافلہ والو دیکھو!
پیش رو آپ کے ہیں کیسے حُدی خواں دونوں

بے کسوں پر ہیں شفیق اور غلاموں پہ فدا
عام ہیں سب کے لیے رحمت و رضواں دونوں

جس کی پیشانی پہ ہے داغِ غلامی اُن کا
اُس کے نزدیک ہیں کیا قیصر و خاقاں دونوں

خوشہ چینوں کو نظر آتے ہیں ان کے یکساں
زٹّل جعفری و حکمتِ یوناں دونوں

ان کے کوچہ کے فقیروں کو خدا کی قدرت
ایک آتے ہیں نظر خسرو ساماں دونوں

ایک رتبہ میں ہیں یاں مادر و حاتم دونوں
ایک طبقہ میں ہیں یاں باقل و سحباں دونوں

ایک حالت میں ہیں یاں کامل و ناقص واللہ
ایک منصب میں ہیں یاں عاقل و ناداں دونوں

ایک ہے ذرہ و خورشید کی یاں کیفیت / ایک درجہ میں ہیں سعد اکبر و کیواں دونوں
جو کمالات و معارف ہیں خلافِ سنت / ان کے نزدیک ہیں دشمن من الاوثاں دونوں
رویتہ النفس و آفاق کو چوں جوز و مویز / جانتے ہیں کہ ہیں بازیچۂ طفلاں دونوں
جامع عشق و شریعت ہیں بتلائیے تو کوئی / یوں بہم کس نے کیے ساغر و سنداں دونوں
اے نوا سنج انا الحق اسے کہتے ہیں کمال / کہ ہیں یہ سوختہ جاں اور ادب داں دونوں
دیکھیں ممدوح کو میرے تو بیاضیں اپنی / غالباً دیویں جلا سعدی و سلماں دونوں
ہے گر انکار کے قابل تو رسالت ان کی / ورنہ ہیں جامع ہر خوبی امکاں دونوں
وہ کمالات و بشارات کہ ہیں قرآں میں / ہیں جب اُن کے لیے یہ محمل و تبیاں دونوں
عین حق ہے جو کہوں اس میں تامل کیا ہے / ق کہ ہیں ممدوح پئے حضرتِ رحماں دونوں
پھر کرے مدح و ثنا ایسوں کی مجھ سا ناداں / صاف ظاہر ہے کہ ہے ہرزہ و ہذیاں دونوں
ابن عربی و غزالی و جنید و نعماں / ق مسندِ علم و عمل جن پہ ہیں نازاں دونوں
یہی حسرت تھی کہ افسوس نہ دیکھا اُن کو / یارو دمساز تھے محرومی و حرماں دونوں
بخدا دیکھ کے دیدارِ رشید و قاسم / دل سے بس محو ہوئے حسرت و ارماں دونوں
معطی حق عزوجل اور یہ دونوں قاسم / ہادی اللہ ہے اور منذرِ عریاں دونوں
عہد کے اپنے ہیں بسطامی و مصری نصری / زہری و علقمہ و شعبہ و سفیاں دونوں
بحر و بر میں نمل و حوت ہیں سرگرم دعا / ملاء اسفل و اعلیٰ ہیں ثنا خواں دونوں
جب تلک عالمِ فانی رہے قائم یارب / اور عالم میں رہیں طاعت و عصیاں دونوں
فیضیاب ان سے رہیں اہلِ جہاں اور ان پر / روز افزوں ہوں تری رحمت و رضواں دونوں
ان کی الفت میں مروں اُن کے غلاموں میں اُٹھوں / سینہ صد چاک ہو اور آنکھیں ہوں گریاں دونوں
دل میں ایمان ہو ایماں میں ہو عشق اُن کا / زیبِ لب عشق میں ہوں نالہ و افغاں دونوں
دل کے سو ٹکڑے ہوں ہر ٹکڑے میں سودا اُن کا / جان صد پارہ ہو ہر پارہ میں پنہاں دونوں

دردِ غم روزِ قیامت میں کرے جب مضطر / یاالٰہی ہوں مرے درد کے درماں دونوں
ضغطۂ نزع و لحد فتنۂ محیا و ممات / دونوں کے صدقہ سے اللہ ہو آساں دونوں
جاؤں عرصات میں جب خائف و نادم تہی دست / دونوں ہاتھوں میں ہوں اُن دونوں کے داماں دونوں
قبر سے اُٹھ کے پکاروں جو رشید و قاسم / بوسہ دیں لب کو مرے مالک و رضواں دونوں
ہووے خلق رہیں ان کے غلام و خدام / اور حساد و عمد و غولِ بیاباں دونوں
ان کے اصحاب رہیں تکیہ زنِ مسندِ دیں / خصم و بدخواہ رہیں خوار و پریشاں دونوں
آل و اتباع ہوں مسعود و سعید و طیب / اور بد اندیش و شقی خائب و خزیاں دونوں
اُن کے چہرہ پہ رہے غازۂ امن و ایماں / زیبِ سر اِن کے رہے نکبت و خذلاں دونوں

عاقبت اُن کے محبوں کی ہو یارب محمودؔ
اور مخالف کو سدا ذلت و خسراں دونوں

قصیدہ

مشتمل بر بعض حالات مدرسۂ عربیۂ اسلامیہ دیوبند

دارالعلوم، دیوبند (ضلع سہارن پور) ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء یوم پنجشنبہ کو دیوبند کی مسجد چھتہ کے مختصر سے صحن میں قائم ہوا، اور نصف صدی کے اندر علوم اسلامی کے درس و تدریس کا ایشیا میں سب سے بڑا اور بین الاسلامی شہرت کا مرکز بن گیا تھا۔ ان سوا سو سال کے اندر اس نے ہندوستان پاکستان کے تمام دینی مدارس سے زیادہ علما، مفسر، مفتی، مبلغ، مناظر، اہل طریقت، اہل درس و تدریس، صحافی، ادیب، خدام ملت اور مجاہدین قوم و وطن پیدا کیے ہیں۔ اس کے اکابر اصحاب علم و عمل کی عظیم الشان اور مسلسل و متواتر خدمات دینی و ملکی نے اسے مذہب و سیاست کے ایک مستقل مکتبۂ فکر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس کے فیض یافتگان نے برصغیر کی مذہبی، علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی، سماجی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ دارالعلوم کا قیام ۱۸۵۷ء کے بعد امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کی دینی و سیاسی تحریک کے فتح باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے قیام سے ولی اللّٰہی تحریک کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کا وجود ہندوستان میں اسلامی علوم کی درس و تدریس کا سب سے بڑا مرکز ہی نہیں۔ ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں بھی مسلمانوں کے رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

اُس کے اکابر و فیض یافتگان نے فکر و عمل میں اعتدال، دینی اعمال و مسائل میں کامل دین داری و تقویٰ، سیاست میں نہایت بیدار مغزی و بصیرت، معاملات میں اعلیٰ ظرفی و دیانت، عمل میں محکم سیرت اور زندگی کے ہر معاملے میں اعلیٰ دماغی اور بہترین اخلاق کے سب سے عمدہ اور متوازن نمونے پیش کیے ہیں۔

تاریخ دارالعلوم کے مصنف مولانا محبوب رضوی نے دارالعلوم کے اوّلین معماروں میں مولانا سید محمد عابد، مولانا مہتاب علی، مولانا محمد قاسم، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، منشی فضل حق اور شیخ نہال احمد کے اسمائے گرامی تحریر کیے ہیں، اور اس کے طبقۂ علیا کے ارکان رفیع الشان میں جسے انھوں نے "اکابر ستہ" کا عنوان دیا ہے، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا حاجی محمد عابد، اور مولانا رفیع الدین دیوبندی کو شمار کیا ہے۔ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح اس قائد علمیہ و دینیہ کے سالار اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شروع ہی سے اس کے سرپرست تھے۔

مدرسہ کے پہلے استاد مولوی محمد محمود دیوبندی اور اس کے پہلے شاگرد محمود حسن تھے جو تاریخ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے نام و لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ دارالعلوم کا قیام چوں کہ اشارۂ غیبی پر عمل میں آیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی اُسے مقبولیت کے شرف سے نوازا، اور اس کے ہمہ قسم کے کاموں میں برکت دی۔ اگرچہ اُس کے اکابر جیسی مقدس شخصیات چشم فلک نے اس سوا سو سال کے عرصے میں نہیں دیکھیں لیکن اس کی تاریخ کا ہر آنے والا دن روشن سے روشن تر کی مثال ثابت ہوا ہے۔ آج بھی کہ برصغیر میں بہت سے دارالعلوم قائم ہو چکے ہیں جو اپنے اپنے دائروں میں بہترین دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دارالعلوم کی مثال نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ ایشیا میں ناپید ہے۔ اور طلبہ و اساتذہ کی بہترین اسلامی سیرتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے تو دنیا میں اس کے اسلامی خصائص و کیریکٹر کی کوئی مثال موجود نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

یہ قصیدہ حضرت شیخ الہند نے جلسۂ منعقدہ ۲۰ صفر المظفر ۱۳۲۴ھ / ۱۵ اپریل ۱۹۰۶ء میں پیش فرمایا تھا اور بہ قولِ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی مرتب "کلیاتِ شیخ الہند" حضار مجلس کو مضطرب و بے قرار بنا دیا۔" (ا۔ س۔ ش)

ہیں منن اور محن دونوں جہاں میں توام　　حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم
کھینچنے کے لیے بندوں کے ہے اللہ اللہ　　عیش و غم کی یدِ قدرت میں کمندِ محکم
انقلاباتِ زمانہ کو سُنا او غافل　　چشمِ تحقیر سے مت دیکھ، نہ کر ایسا سِتم
سائقِ لطف ہے ہر راحت و شادی یاں کی　　قائدِ خیر ہے دنیا میں ہر اک رنج و الم
رحمت و فضلِ خدا جب ہے غضب پر سابق　　کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں ہم لطف و کرم
اُس کی آغوشِ غضب میں ہیں ہزاروں رحمت　　اُس کے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف و کرم
فضل سے اُس کے کسی وقت نہ ہو نا مایوس　　خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم
رحمتِ حق کی ہے تمہید سمجھ او ناداں،　　پیش دنیا میں جو کچھ آتا ہے اندوہ الم
انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سُن لو　　ہر تغیر سے صدا آتی ہے فَافْہَمُ فَافْہَمُ
لِلّٰہِ الحمد مری جان اور اِنّا لِلّٰہ　　مرغِ ایمان کی ہیں بازوئیں دو مستحکم
دانۂ ودام سے کرتے ہیں کسی کو پابند　　زخمِ شمشیر سے کرتے ہیں کسی کو بے دم
کسی کو خوف دلاتے ہیں کسی کو اُمید　　کسی کے تیر لگاتے ہیں کسی کے مرہم
ہے وہی شاکر و صابر کہ بطوع و رغبت　　سامنے اُن کے کرے گردنِ تسلیم کو خم
دور اندیش دلی ہے کہ مصائب کے عوض　　ہو کے خوش مرضیٔ مولیٰ کی کرے بیع سَلَم
جزر و مدِ بحرِ حوادث کا بچشمِ حق بیں　　طرۂ شاہدِ تقدیر کا ہے پیچ و خم
گردشِ دہر دکھاتی ہے ہمیں آنکھوں سے　　کُلَّ یَوْمٍ ہُوَ فِیْ شَانٍ کا نقشہ ہر دم
کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھنگھور گھٹا　　جس طرف آنکھ اُٹھاتے تھے محیطِ عالم
آبِ حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی　　ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی اَعْمٰی و اَصَمّ
حافظِ علم تھا اِک سینۂ صندوق فقط　　نہ کوئی حامی و غم خوار نہ کوئی ہمدم
رحمتِ حق ہوئی حامی تو یکایک اُٹھے　　چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم
یوسفِ علمِ شریعت کے خریدار بنے　　جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدود درم

سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنامِ ایزد　　کوردہ[1] میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہمم
شوق کہتا تھا بڑھو ضعف کہے تھا ٹھیرو　　ناتوانوں کا تھا کیا کیسے عجب ضیق میں دم
اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں کہ اک مردِ خدا[2]　　آرہا تیز روی سے ہے لیے ساتھ عَلَم
بے نیازی و توکل رُخِ روشن سے نمود　　قطعِ منزل کے لیے دونوں قدم تیغِ دو دم
چہرۂ خوب سے انوار تواضع ظاہر　　نظرِ نیک سے آثارِ غنا مستفہم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفور　　پڑ گئی جان میں جان آ ہی گیا دم میں دَم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور　　زینۂ بامِ ترقی پہ پڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اُس مردِ صفا کی سج دھج　　تھے عجائب ہی کچھ اُس شیرِ خدا کے دم خم
گاڑ کر اُس نے علم ایک ندا کی ایسی　　یک بیک چونک پڑے اہلِ مدر اہلِ خیم
اُس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی　　کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم
عقل و انصاف کا بس سر میں ذرا بھی تھا اثر　　ذوقِ علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا سا بھی دم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُودَع　　خیر کا شمہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم
باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نَحْنُ مَعَكَ　　جس جگہ اُس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
اُس مربیِ دل و جاں کی مسیحائی سے　　علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عدم
ظلمتِ جہل و ضلالت میں پڑے سوراخنے　　نورِ علمی سے ہُوا اُس کی جہاں صبحِ دودم
ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا　　جس جگہ اُس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
جہل کو جب بھی کہنے لگے اِخْسَأ اِخْسَأ　　چل دیا پاؤں دبے چپکے سے بابختِ دژم
علم کو لا کے ثریا سے ثریٰ پر رکھا　　آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ
دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو　　قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اُس کا عَلَم
اُس کی آواز تھی بے شک قُم عیسیٰ کی صدا　　جس کے صدقہ سے لیا علم نے دوبارہ جنم

[1] قصبہ دیوبند کی طرف اشارہ ہے۔ [2] قاسم العلوم حضرت نانوتوی کی طرف اشارہ ہے۔

طائرِ علم شریعت کے لیے یہ دو یمن — برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے ماموں حرم
سلسلے علم کے امصار و قُرلے تک جاری — اُس کی ہمت سے ہوئے بل بے ترا فیض اعم
جملہ اعیان و اکابر تھے جلو میں اُس کی — اُس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم
یک بیک حکمتِ باری نے جو پلٹی کھائی — چل دیے چھوڑ کے یاں سب کو سوئے باغِ ارم

لوٹتے آگ پہ تھے حضرتِ یعقوبؒ رفیع — خون آنکھوں سے بہاتے تھے رشیدِ عالمؒ
دیکھ کر حضرتِ امداد کی زاری کو ملک — پر سمیٹے ہوئے کہتے تھے الٰہی ارحم
اہلِ علم اہلِ ورع خاص و عوامِ عالم — سب نے تقسیم کیا پر نہ ہوا کم یہ غم
فرقِ درجات کا قصہ تو جدا ہے لیکن — عام تھا عالمِ اجسام میں اُس کا ماتم
متزلزل ہوئے سب مدرسہ کے رُکنِ رکیں — ہل گئے ہائے غضب سلسلۂ خیر کے تھم
علم آتا تھا نظر ایک یتیمِ بے کس — اہلِ علم آہ تھے مایوس بچشمِ پُرنم
قاسمِ علم چلے علم بھی لو ساتھ چلا — کس کو تھا موگے کہو پکڑو گے کس کس کے قدم
ایک کا کرنا سفر دوسرے کا عزمِ سفر — جانِ عالم کے لیے دونوں تھے سوہانِ الم
ہو گیا سب کو یقیں باندھ لیا سب نے خیال — سلسلۂ علم کا بس ہو گیا درہم برہم
اسی مایوسی و مجبوری و حیرانی میں — مجتمع ہو کے اکابر نے بچشمِ پُرنم
حضرتِ مرشدِ عالمؒ سے تمنا یہ کی — آپ اب اپنے تصرف میں لیں یہ کارِ اہم
غایتِ خلق سے فرمایا نکما ہوں میں — باقی ہر حال میں ہوں ساتھ تمہارے منضم
چند کلمے کہے نرمی سے تسلی آمیز — ہو گئے زخم رسیدوں کے جگر کو مرہم
ہائے وہ نیچی نظر ہائے وہ شیریں الفاظ — کس غضب کے تھے کہ سب دور ہوئی تلخیٔ سم
آپ کی پاک توجہ سے ہوا سب کو سکوں — علم کے اکھڑے ہوئے جم گئے واللہ قدم
کام اس مدرسہ کا فضل و کرم سے اُس کے — الغرض رو بترقی ہی رہا ہر ہر دم
مذہبی جتنے سلاسل تھے رہے سب جاری — کام کوئی نہ رُکا سہل تھا وہ یا مہتم

بعد چندے ہوا نیرنگیٔ قدرت کا ظہور — یعنی یعقوب و رفیع ہر دو وزیرِ اعظم
ہو کے مشتاقِ لقا پہنچے یکے بعدِ دگر — خدمتِ قاسمِ خیرات میں شاد و خرم
دست و پا بھی لو چلے سر تو تھا پہلے ہی گیا — قلب بس باقی رہا یعنی رشیدِ عالم
وہ بھی مجروحِ ستم دیدۂ ہجرِ احباب — جُرعہ نوشِ ستم و دُرد کشِ ساغرِ غم
اسی اندوہ و غم و یاس میں سبحان اللہ — رحمتِ حق ہوئی مبذول بحالِ عالم
بھر دیا قلبِ مقدس میں تمام عالم کا — درد و غم خیر و صلاح خوب ملا کر باہم
خاص کر ترکۂ قاسم کی محبت واللہ — بے طرح اس دلِ اقدس میں ہوئی مستحکم
سب کی الفت پہ تھی اس کی ہی محبت غالب — سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم
پھر تو کیا تھا دی خدا نے وہ ترقی اُس کو — دیکھ لیں آپ، کہیں اپنی زباں سے کیا ہم
پوچھتے کیا ہو دماغوں کا ہمارے احوال — ہم غریبوں کا زمیں پر نہیں پڑتا تھا قدم
نہ رُکا پر نہ رُکا پر نہ رُکا پر نہ رُکا — اُس کا جو حکم تھا، تھا سیفِ قضائے مبرم
نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے — فتنہ نے سر نہ اُٹھایا کہ ہوا ہو نہ قلم!
کلفتیں جھیلیں سبھی پر نہ ہوا چیں بجبیں — دِقتیں دیکھیں ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم
دشمن و دوست کے چہرہ میں تفاوت ہے حیال — سرسوں پھولی تھی وہاں اُس نے ملا تھا عندم
مشکلات ہوتے تھے سب اُس کے اشاروں پر طے — مہر اور قہر میں تھے اُس کے نعم اور نقم
نہ رہا کوئی وزیر اور نہ رہا کوئی مشیر — سارے قصے تھے اور اُس شیرِ خدا کا اک دم
سب مریضوں کے لیے ایک ہی تھا آثار — سیکڑوں زہر تھے تریاق تھا بس اُس کا دم
داغ ہے لفظِ نعم کو کہ خلافِ حق پر — مُنہ سے اس کے کبھی نکلا نہ خدا ہی کی قسم
لا کو حسرت ہے یہی اور نہ ہووے کیونکر — شکل دیکھی نہ کبھی اُس کی دُعا کی اک دم
قاسم و حضرتِ امداد کو مرنے نہ دیا — بلکہ زندہ ہی رکھا سب کو علیٰ وجہِ اتم
مُردوں کو زندہ کیا زندوں کو مرنے نہ دیا — اِس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابنِ مریم

ہائے غم ہائے ستم ہائے غضب ہائے الم — آج اُس سے بھی ہوا دیکھ لو خالی عالم
آگے کہنے کی ہے کچھ بات نہ سُننے کی تاب — لب تلک آتا ہے لیکن یہ مقولہ پیہم
رحم بر بے کسیم ہیچ نہ کردی رفتی — ایکہ کفِ پائے تو بود تارجِ سرم
آج تو قاسم و امداد سبھی مرتے ہیں — ان کا کیا ذکر ہے برباد ہوئے تم یا ہم
منتظر بیٹھے ہیں اب ہم پہ گزرتا کیا ہے — قہر کا خوف ہے پر ساتھ ہے اُمیدِ کرم
تو رحیمؐ ملک و بار ہے سلّمہٗ سلّمہٗ — ہم جھول اور زیاں کار ہیں ارحم ارحم
اے اسیرانِ غم قاسمؒ خیر و برکات — دے فقیرانِ سرکوئے رشید جانم
پیروی کرتے رہو سعی کو ہاتھوں سے نہ دو — بدمے یا درمے یا قدمے یا بقلم

بے نمک ہیں مرے اشعار مگر تلخ نہیں
خالی از درد نہیں گرچہ ہیں سُست پستم

قصیدۂ خیر مقدم و تہنیت

امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان کے وُرُودِ ہندوستان کے موقع پر

امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان (۱۸۷۲ء ـ ۱۹۱۹ء) نے ہندوستان کا یہ سفر ۱۹۰۶ء کے اواخر اور ۱۹۰۷ء کے اوائل میں کیا تھا۔ کسی ذریعے سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ امیر مرحوم کے حضور میں حضرت نے یہ قصیدہ خود پیش کیا ہو یا پڑھا ہو۔ امیر مرحوم کے ورودِ ہند کے موقع پر حضرت کا کسی مجلس میں شریک ہونا بھی ثابت نہیں۔ خیال یہ ہے کہ حضرت نے یہ قصیدہ لکھ کر کسی ذریعے سے امیر مرحوم کی خدمت میں بھجوا دیا تھا (ایس مشی)

فزودہ شوکتِ اسلام و در رہ رحم رواں آمد — سوئے ہندوستان شاید حبیب اللہ خاں آمد
مہِ اسلامیاں آمد شہِ ایمانیاں آمد — امیرِ خسرواں آمد شہِ گیتی ستاں آمد
نہنگے سوئے بحر و شیر سوئے نیستاں آمد — بملکِ ہند یعنی والیِ کابلستاں آمد
فروغ اخترِ ملہین و نورِ طالعِ بنگر — سراجِ ملت و دیں بر سرِ ما میہماں آمد
فطوبیٰ لک نہ ہر سو بر لبِ روحانیاں رفتہ — اتیتم اہلاً و سہلاً کلامِ انس و جاں آمد
امیرِ حق پسند و نکتہ داں فضلِ خداوند ست — ز فضلِ او امیرِ حق پسند و نکتہ داں آمد
بود ظلِ الٰہی قہرمانِ مہرباں بر خلق — فدائے رحمتِ او قہرمانِ مہرباں آمد

بعقل و بخت گر شاہے خوش آمد نے بتاج و تخت — امیر ما بعقل پیر و بابخت جوان آمد !
وجودِ خسروِ حامیِ دیں عنقا است در عالم — بحمد اللہ شاہے دین حق را پاسباں آمد
بہ بحر ابر مہ نیساں و در کنعانیاں یوسف — بجوے خشک آب و در چمن سرو رواں آمد
بجوشش خرمی و شادمانی صوفی و مُلّا — ز شوقِ نغمہ سنجی در شمار شاعراں آمد
ہماں آتش کہ کفار سیہ را کرد خاکستر — بہندستاں پئے سیرابیٔ لب تشنگاں آمد
تعالی اللہ آمد از دریا معدلت کیشے — کہ بر خوان سخایش ماہ و پرویں میہماں آمد
شہنشاہے کہ بر لبہائے جاں از عالم علوی — سنینِ مقدمش در ہند تاج خسرواں آمد
سرود جود و جاہش گشت معن و حاتم طائی — سبق گیراں ز عدلش سنجر و نوشیرواں آمد
ز عدلش شمع بر پروانہ شد نار خلیل اللہ — پئے کنجشک بیں بال و پر باز آشیاں آمد
ز انفاس نفیس میر عالی جاہِ من کابل — برائے دولت و دین و اماں دار الاماں آمد
زبانش با دل او در رضائے حق شدہ یک دل — دل او با زباں در ذکر مولیٰ ہم زباں آمد
کفش را چوں لبش بر اہل عالم حکمراں بینی — لب او در سخن ہمچوں کفش گوہر فشاں آمد
لبش گوہر فشان و تیغ او را سر فشاں نامند — کف او زر فشاں و قہر او اخگر فشاں آمد
شہے تیغ آزمائی کز نہیبش بر لب دشمن — بجائے نعرۂ ھل من مبارز الاماں آمد
عدو بر سخت جانی نازد و غافل نمی داند — کہ ایں سختی برائے تیغ او سنگ فساں آمد
نیازی شوے درع و خود چوں آرد بک دستے — کہ گردشہائے تیغش اسپ را برگستواں آمد
ندارد احتیاجِ کثرتِ فوج و سپہ ہرگز — خوش اقبالیکہ او را فتح و نصرۃ ہم عناں آمد
خیالِ خام حاسد دور کن توقیع سلطانی — نمی بینی بسو از بارگاہ کن فکاں آمد
ز دام عنکبوت اندیشۂ کامد بہ شہبازے — بشاہنشہ ہماں خوفے ز کید حاسداں آمد
ز قدر و شوکت سلطاں کہ اقلیمش خدا داد است — دلِ حُساد چنداں سوخت و دے از دہاں آمد
قلوبِ مومناں چوں جائے او آمد غلط نبود — اگر گوئی مکانش خوب تر از لامکاں آمد
عجب دارم سراپا حیرتم محو تماشایم — کہ نزد تشنگاں یا رب چہ شیریں جاں آمد

سپاسِ حق بجا آرم فروغ بخت را نازم — کہ تیر آرزوے ما غریباں بر نشاں آمد
ز ذکر احتساب او کہ در بُت خانہ ہا رفتہ — بجائے نالۂ ناقوس غلُ بانگِ اذاں آمد
ہماں رندے کہ بر اوضاع زاہد طعنہا نے زد — بریش و جُبّہ و تسبیح مثل زاہداں آمد
بکفر و زندقہ خوانید بر بندید حملہا — کہ آں غارت گر الحاد در ہندوستاں آمد
کرامت بیں زمین آگرہ از پابوسِ او — ببالید آں چناں پایش فراز آسماں آمد
گمانم شد رجوع قہقری کردہ مگر دوراں — فتادہ غلغلہ در آگرہ صاحبقراں آمد
قران نیّریں را بر فلک باشد عجب نبود — زمینِ آگرہ یا للعجب جائے قراں آمد
بہار گلشنِ صدق و مؤدۃ را تماشا کن — صلیب امروز دمساز درفش کاویاں آمد
وداد و اتحادِ ہر دو دولت باد مستحکم — باخلاصے و انصافیکہ شایانِ شہاں آمد

عزیزا زہر کارِ خود کند گو در شکر باشد
بگوشم ایں معمّا از لبِ پیر مغاں آمد

تو می گوئی کہ نصر اللہ خاں رفتہ سوئے لندن — بیا بنگر بہندستاں حبیب اللہ خاں آمد
کند ہندوستاں گر فخر بر یورپ مکن انکار — شہ ملک خداداد اندراں با عز و شاں آمد
نزول حضرت آدم بہند از خُلد باور شد — چو دیدم شاہ سُوئے اُو ز کابل شادماں آمد
سکندر بارگاہا دیں پناہا مشتری جاہا — کہ خاقانی بمدحت الکنِ کج مج زباں آمد
نہ پنداریں کہ ایں مور ضعیفے بے سر و برگے — بایں بے مائگی نزدِ سلیماں مدح خواں آمد
نہ ملک و مال می خواہد نہ با عزت سرے دارد — برائے عرض حالے بر درت ایں خستہ جاں آمد

عرضِ حال

جدید ایں فلسفہ تا طرح خود انداختہ در ہند — چہا ظلمے کہ بر دیں از سفیہان زماں آمد
ز منقولات بے بہرہ ز معقولات بے مایہ — بعادات و باستقرائے ناقص کار شاں آمد

ستمہائے دوستاں

رسالت را کسے منکر، کسے گوید نبی ہستم
کسے از وسطِ ہند آمد، کسے از قادیاں آمد[1]

وجودِ دوزخ و جنت، ملک جن و قیامت نیز
بسانِ غول و نابش لغو و باطل پیش شاں آمد

نماز و روزہ و عمرہ، زکوٰۃ و حج بیت اللہ
بچشم شاں (خدایا کور بادا) رائیگاں آمد

نزولِ وحی و معراج و ظہورِ معجزہ ہیہات
بزعم گمرہاں افسانہائے پاستاں آمد

حدیث و فقہ و تفسیر و ہمہ احکام شرعیہ
بنزد ماکساں بے اعتبار و بے نشاں آمد

علومے راکہ فخر الانبیا میراث خود گفتہ
ز تندیِ حوادث در بہارِ او خزاں آمد

علوم دیں کہ تفسیر و حدیث و فقہ شد نامش
چہ کالائے زبون و ہیچ کاسد رائیگاں آمد

علومے راکہ ختم المرسلینش جہل فرمودہ
وقاحت بیں کہ بر علم نبی چشمک زناں آمد

ز قرآں حکم لا اکراہ فی الدیں یاد شاں ماندہ
ز اقوال نبی اَلدِّیْنُ یُسْرٌ بر زباں آمد

ستمہائے کہ کردہ بر سر اسلام اعدائش
ہزاراں بار زاں افزوں ز ناداں دوستاں آمد

من از بیگانگاں ہرگز نمی نالم کہ بر جانم
بلاہائے کہ شد نازل ز دستِ دوستاں آمد

ستمہائے عزیزاں آں چناں زار و زبونم کرد
کہ فریادم شنیدہ غیر و بر من مہرباں آمد

مظالم بیگانگاں

ہُنرمندانِ انگلستاں کہ آئینِ جہاں بانی
چناں بستہ کہ ہندوستان محسودِ شہاں آمد

پئے روحِ ترقی قالب خوش گشت ہندوستاں
برائے مرغ آزادی چہ نیکو آشیاں آمد

بسعی خویش داد و دانش آں چناں دادند
کہ از بینش ہندوستاں بہار بے خزاں آمد

له وسطِ ہند سے پیدا ہونے والے سرسید احمد خاں اور قادیان سے نبوتِ باطلہ کا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد کی طرف اشارہ ہے۔ سرسید کے عقائد کے بارے قدرے واضح اشارے حضرت علیہ الرحمہ کے یادگار قطعاتِ تاریخ وفاتِ سرسید میں موجود ہیں۔ (ایس بش)۔

برنگ و بو چناں آراستند ایں زالِ فانی را
ہوسنا کے کہ سویش دید آبش در دہاں آمد

ہمیں دنیا کہ او را جیفہ و لہو و لعب خوانند
بچشم تنگ چشماں چوں بہشت جاوداں آمد

خساں بر خال و خطِ زالِ دنیا دل چناں دادند
کہ ذکر و فکر دیں در دل بگنبد گرد گاں آمد

بہر امرے چناں دادند آزادی کہ دمہ را
کہ خار و سبزہ ہم آزاد چوں سرو رواں آمد

چناں شد نیک و بد پابند آزادی و بے قیدی
کہ بے طوق اے عجب جید سگاں و قمریاں آمد

قیودِ دین و احکامِ خدا آزاد طبعاں را
عذابِ تاب فرسا داغِ دل سوہانِ جاں آمد

سبک سر آنچناں بر خطِ حکم نفس بنہادند
کہ پابندی مذہب نزد شاں سنگِ گراں آمد

یکایک ربقۂ اسلام از گردن بروں کردند
بدل جوشِ جنوں آمیز آزادی چناں آمد

بزعم خویش ہر دنیا پرستے عبد دینارے
برائے غارتِ دینِ متیں چنگیز خاں آمد

سرائے فانی و دارِ بلاکش سجن فرمودند
ز رفع قیدِ مذہب پیش شاں باغِ جناں آمد

تعصب قیدِ مذہب راکہ میدانند نمیدانند
کہ با الحاد ایں آزادی او تواماں آمد

چو نورِ مہ کہ از خورشید آمد ہم چناں در ہند
ترقیات و آزادی ز یورپ ارمغاں آمد

چہ دنداں در جگر افشردہ باشم از غم و حسرت
چو بینم گلشنِ اسلام پامالِ خزاں آمد

سگِ دنیا کند بر اہل دیں گر چیرہ دستیہا
عجب نے۔ ہر سگے در کوئے خود شیر ژیاں آمد

چہ خوش فرمود آں دانا دلِ شبیر از حق بینی
بدی کردن بمقبولاں نکوئی با بداں آمد

ز مرؤس و ز رئیس و دشمنان و دوستاں مدیحت
بعلم دیں چہ گویم دور باش از ہر کراں آمد

نہ غمخوارے نہ یارے کس بپرسم کس تحر ماندہ
ہماں علیکہ مداحش خدائے دو جہاں آمد

ز ہر سو قطع کردہ دل گرفتہ چشم بربستہ
نگاہِ آرزویش جانب شاہِ شہاں آمد

علوم دین و اہلش التفاتے خاص میخواہند
ز سلطانیکہ نامش بہر اوشاں حرزِ جاں آمد

سرائے مخلصانِ با صفا روئم کہ نزدِ من
کسے نازید بر اغیار کز دیوانگاں آمد

مپرس از حالِ زارِ ما تہیدستیم و پا لنگ است | زدستم خیرو پایم سیر شاہا چوں نواں آمد
زخوف فتنہ ہائے حاسداں ضبطِ نفس کردم | زبیتابی دگر نہ بارہا بر لب فغاں آمد
کنوں چوں مژدۂ فیض قدوم شہ ز جانم برد | بامید یکہ دارم ایں نشیدم بر زباں آمد
بفریادم رسد گر شہ بود شایانِ او ورنہ | بگویم انچہ در نقدیرِ ما بودہ ہماں آمد
مدہ زحمت خموشی ورنہ دیگر وا مکن لب ہا | کہ شاہنشاہ عالی جاہ مانا گفتہ داں آمد
الٰہی رحمت و فضلِ تو بر روئے باد و بر آتش | چناں کو بر غریباں در عطا یا مہرباں آمد

نگہدارش ز کیدِ حاسدِ گندم نما یارب
کہ او حامئِ علم و دیں دریں دورِ زماں آمد

حوالہ: ماہنامہ برہان، دہلی۔ مارچ سنہ۔ (افسوس کہ فوٹو اسٹیٹ بنوانے میں سنہ۔ کٹ گیا، پرچہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے برہان کا جو اشاریہ (علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا) مرتب کیا ہے، اس میں بھی جلد نمبر اور شمارے کا اندراج نہیں (س۔ س۔ ش)

مراثی وقطعات تاریخِ وفات

نظمِ تاریخی بر وفات

بحر العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر چشم مثلِ ابر ہے کیوں اشکبار حیف | ہر سینہ مثلِ لالہ ہے کیوں داغ دار حیف
کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہان کو | دم میں ہوئی خزاں سے بدل بہار حیف
ہے کیا سبب جہان میں آتا نہیں نظر | جز آہِ دردناک و دمِ شعلہ بار حیف
ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعائے مرگ | آتا نظر ہے ہر کوئی زار و نزار حیف
زیبِ جبین ماہ مبیں کیوں ہے داغ دار | زخمی جگر ہے کیوں گہر آبدار حیف
مسکن بدیہ دل میں ہے کیوں یاس و اضطراب | صبر و سکوں سے آتی ہے کیوں ہم کو عار حیف
آنکھوں میں جوشِ اشک ہے سینہ میں درد ہے | دل میں غم و الم ہے زباں پر ہزار حیف
مونس الم، رفیق فغاں، غم گسار غم | ہم دردِ درد، ہم نفس آہ، یار غار حیف
سر ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک اُف | دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف
یہ زندگی ہے یا کوئی طوفانِ مرگ ہے | غم جی میں، اشک آنکھ میں، دل میں غبار حیف
کیسی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیا نشاط و عیش | وردِ زبان اب تو ہے لیل و نہار حیف

دشنہ کا کیوں گلہ ہو ہے بس دبہ اشتیاق
خنجر پہ غش ہے کیوں جگر بے قرار حیف

چھنے پہ جان دیتے تھے ہم کل کی بات ہے
زہر آب مرگ آج ہے کیوں خوشگوار حیف

کل تک تو آرزو تھی ہمیں عمر خضر کی
ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف

رشک خزاں بہار ہوئی دشمن نشاط
محسود مرگ زیست ہوئی غمگسار حیف

یہ کون اٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھ جائے ہے
یہ کون چھپ گیا ہے کہ رشتہ آشکار حیف

خورشید علم آج ہوا کون سا غروب
عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف

کس خاکسار کا ہے یہ ماتم کہ جانے اشک
برسے ہے چشم دہر سے پیہم غبار حیف

بس خط بخط وصبور کا شیون ہے یہ کہ آہ
سینہ سے لب تک آتی نہیں زینہار حیف

جو باعث نشاط دل ناصبور تھا
روتے ہیں اس کے ہجر میں اب زار زار حیف

ہر بات جس کی مایۂ صبر و تسلی تھی
عالم ہے اس کے ہجر میں اب بیقرار حیف

جب باعث حیات ہی ہو موجب ممات
اللہ کیا کرے دل امیدوار حیف

وہ آن بان دوش احبا ہے حسرتا
جو ڈالتا کسی پہ نہ تھا اپنا بار حیف

عالم میں جس کا مثل عدیم الوجود تھا
لو اٹھ گیا جہاں سے وہ کوہ وقار حیف

محروم زیست قاسم بزم ہدیٰ دریغ
آغوش گور عارف شب زندہ دار حیف

تقریر دلپذیر ہو جس کی غذائے روح
وہ لقمۂ اجل ستم روزگار حیف

عیسیٰ دم اور صرصر مرگ اے فلک دریغ
گنج علوم وہبی و کنج مزار حیف

موسائے وقت و سحر اجل وامصیبتا
خضر زمان و گوشہ نشین حصار حیف

یوسف لقا و چاہ لحد ہم دم احتضار
دیو قضا و آصف دوراں شکار حیف

زیر زمین طائر عرش آشیانہ آف
بالائے چرخ زیب دہ روزگار حیف

باد خزاں و گلشن دیں اے زمانہ آہ
برق فنا و خرمن صبر و قرار حیف

کشاف علم دین ہو اور پردۂ عدم
موج قضا ہو کشتی عالم سے چار حیف

جان جہاں ہو رہن عدم وائے بے کسی
پامال خاک رہ ہو در شاہوار حیف

آیا قرار آپ کو بس جا کے زیر خاک
اللہ رے غضب ہوس انکسار حیف

گردن پہ تیرے خون ہے سارے جہان کا
تیرا بھلا نہ ہو ہوس انکسار حیف

سنتے تھے ہے عدم میں نظیر جناب پر
کیوں قصد آپ نے کیا با جسم زار حیف

سوہان جاں ہیں آپ کے الطاف جانفزا
بد قسمتی سے نور ہوا ہم کو نار حیف

گنتے تھے ہم بھی جان نثاروں میں آپ کو
اس دعوے غلط سے ہیں اب شرمسار حیف

ہے آپ زیر خاک ہوں اور ہم بقید زیست
کیا منہ دکھائیں گے تمہیں روز شمار حیف

اس مایۂ حیات کی فرقت ہیں یا نصیب
ہو پائدار ہستی ناپائدار حیف

ہوتی نہ سخت جانی اگر مونس فراق
تو کام کر چکا تھا غم ہجر یار حیف

ہم دولت وصال سمجھتے تھے لازوال
تھی کیا خبر کہ ہوگا یہ انجام کار حیف

کیوں کر جئیں یہ آپ کے خادم بتایئے
امید مرگ ہی نہ ہو گر غمگسار حیف

رنج و فراق و کلفت غم صد ہائے ہجر
لائق اسی عطا کے تھے کیا جاں نثار حیف

بن جائیے اپنے واسطے خضر رہ عدم
آتا نہیں ہے ایسا نظر دوست دار حیف

ہاں اے اجل خدا کے لیے چشم التفات
بے روئے یار زیست ہے، اب ہم کو بار حیف

یاں جاں بلب ہیں آپ کو اصلا خبر نہیں
ایسا شفیق اور ہو غفلت شعار حیف

وہ قلب جو کہ محو نیاز حضور تھے،
اب ان کو تیغ غم سے کریں یوں فگار حیف

پائے جناب جن سے باتے تھے کل ہیں آج
وہ ہاتھ زیر سینہ و فرق و عذار حیف

واں ہم سے خستہ جانوں کی کیا قدر ہو جہاں
غلماں ہوں اور ملائکہ خدمت گزار حیف

وا حسرتا جو آپ کے حلقہ بگوش تھے
پھرتے ہیں آج جوں شتر بے مہار حیف

علم و ذکا سے آپ کے جو بہرہ مند تھے
پھرتے ہیں کوہ و دشت میں دیوانہ وار حیف

پھرتے ہیں آج فکر میں آب حیات کی
کل تھے جو آہ آپ کے تیمار دار حیف

سرگشتۂ تلاش اطبا جو کل تھے، آج … فکرِ مسیح و خضر میں ہیں دل فگار حیف
اب اپنی موت کی ہیں وہ تدبیر سوچتے … جو آپ کی حیات کے تھے خواستگار حیف
ہو آپ کی حیات تلک خاک دسترس … جب اپنی موت ہی پہ نہیں اختیار حیف
پھولا نہیں سماتا ہوں کہتا ہے جب کوئی … کیا اعتبارِ ہستی بے اعتبار حیف
زیرِ زمیں ہی چل کے رہو ہمدمو کہ ہاں … کچھ لطفِ زندگی نہیں بے روے یار حیف
سر پہ ہو کوہِ غم تو تڑپنا بھی ہے محال … نکلیں گے کس طرح مرے دل کے بخار حیف

اب خوابِ وصل ان کو ہے سرمایۂ نشاط … جن کو خیال ہجر بھی تھا ناگوار حیف
نقشہ[1] و ہنر کمال و سخا جود و اتقا … دستِ قضا سے ہوں بے سر و پا ہزار حیف
وہ دیوبند رشکِ ارم جس کا تھا لقب … کہتا ہے عالم آج اُسے دشتِ خار حیف
عالم سے ظلِ رحمتِ حق جب کہ اٹھ گیا … رہ رہ کے کیوں نہ آئے مجھے بار بار حیف
کشافِ دین و کتمِ عدم والے بخت بد … شمسُ الهدیٰ پہ نشینِ غبارِ حیف
کشتیٔ نوح و صدمۂ طوفان الاماں … طغیانیِ حوادث و کوہِ وقار حیف
جورِ سپہر و تکیہ گہ بے کساں نفساں … الطافِ مرگ و عالمِ شب زندہ دار حیف
زیرِ زمین طائرِ عرش آشیان اُف … بالائے چرخ زیب دہ روزگار حیف
تحت الثریٰ و چشمۂ آبِ بقا غضب … سنگِ مصائب و شجرِ بار دار حیف
وقفِ سموم ہو گلِ شاداب ہائے ہائے … پامالِ خاکِ رہ ہو درِ شاہوار حیف
مل جائیں[2] فضل و علم و عمل اف زمین میں … پیوندِ خاک زہد و سخا ہوویں ہزار حیف
جائیں عدم میں فضل و کرم جود ہائے ہائے … عالم ہو اور ماتم و حسرت ہزار حیف

گو دم نہیں[3] پہ نکلے ہے دل سے یہی صدا
پژمردہ آہ ہو گلِ خنداں ہزار حیف
۱۲۹۷ھ ۔ ۴۴ ۔ ۱۳۴۱

[1] فقر - ہنر - کمال - سخا - جود (و اتقا - کے بے سر و پا ہو جانے پر جو الفاظ باقی رہتے ہیں وہ مادہ تاریخ ہیں اور وہ یہ ہیں ق - ن - ما - خ - د - تق - ان کے اعداد (۱۲۹۷) ہیں جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ہجری سنہ کے ہیں ۱۲

[2] مادۂ تاریخ کے لیے فضل - کرم - جود کو عدم کے ساتھ شامل کیجیے - عالم - ماتم و حسرت کے اعداد (۱۲۹۶) ہیں - ایک کی کمی ہے - تاریخ وفات کے مادہ میں ایک کی کمی اگر رہے تو معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے - جس طرح تاریخ ولادت کے مادہ میں اگر ایک زائد ہو مستحسن ہے - یہ مادۂ تاریخ غالباً اسی قاعدہ کے لحاظ سے نکالا ہے ۱۲

[3] دوسرا پورا مصرعہ بتخرجۂ (دم) مادۂ تاریخ ہے ۱۲

عہ اس نظم کے مندرجہ بالا اشعار اور آخر کے تین اشعار سوانح قاسمی جلد سوم سے ماخوذ ہیں اور یہ آٹھ شعر مولانا افضال الہیٰ صاحب دیوبندی کی عنایت سے حاصل ہوئے اور مولانا موصوف کے شکریے کے ساتھ نقل کیے گئے - (ا - س - ش)

مرثیہ بروفات

حضرت قطب العالم خاتم الاولیاء والمحدثین فخر الفقہاء والمشائخ مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ

مولانا رشید احمد گنگوہی کا شمار دیوبند کے اکابر میں ہوتا ہے۔ ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق یکم جون ۱۸۲۷ء کو گنگوہ (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں مملوک العلی، شاہ عبد الغنی مجددی اور مفتی صدر الدین سے تحصیل علمی فرمائی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت اور اُن کے خلیفہ ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق رہے تھے۔ اور دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور مفتی و محدث تھے۔ درس و تدریس اور بیعت و ارشاد کا شغل تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقع پر معرکۂ شاملی میں شریک تھے، گرفتار ہوئے اور ایک مدت تک قید رہے۔ دار العلوم دیوبند کے سرپرست تھے۔ ۹ جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ مطابق ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء کو انتقال فرمایا۔ (ا۔ س۔ ش)

متاعِ دہر پہ غرّہ نہ کر ہے سخت نادانی
غذائے مور ہیں دیکھا جو کرتے تھے سلیمانی

عجب نادان ہیں جن کو ہے تخت و تاج پر غرّہ
کسی کی قیصری باقی رہی اس جا نہ خاقانی

دریغا صرصرِ بادِ حوادث سے ہوئی برباد
کہاں ہے گنجِ باد آورد اور تختِ سلیمانی

زمانہ میں ہوا جو کچھ فنا ہونا ضروری ہے
زمانی اور بقا توبہ۔ زمانہ تو ہے خود فانی

یہ نیرنگی حوادث کی جب اپنا گل کھلاتی ہے
بنے گورِ غریباں دم کے دم میں صحنِ بُستانی

جو گلہائے شگفتہ تھے یکایک ہو گئے غنچے
بلا کی آئی باغِ دہر میں فصلِ زمستانی

جہاں تھا خندۂ شادی وہاں ہے نوحہ ماتم
جو تاجِ خسروی تھا آج ہے کشکول سلطانی

سراغِ پا تلک ملتا نہیں پہنچے کہیں ایسے
تلاشِ رفتگاں میں گرچہ ہم نے خاک تک چھانی

فلک کے ایک ہی دستِ جفا میں ہمنشیں دیکھا
کہ اِک عالم کی عمریں کٹ گئیں کیسی بآسانی

ملا یا خاک میں ہم کو فلک نے ایک شوخی میں
ارے ظالم نہ کر اتنی زیادہ نامسلمانی

ملا کر خاک و خوں میں بے کسوں کی آرزوؤں کو
پھر ہم سے پوچھتا ہے ہائے ظالم وجہ گریانی

شکایت ظلم کی بے جا ہے اُس چرخِ ستم گر سے
جسے جمعیتِ خاطر ہو خلقت کی پریشانی

ستم ہائے فلک سب سہل تھے پر اس کو کیا کیجے
وبالِ جان ہم کو ہو گئی اپنی گراں جانی

بجومِ یاس میں مہلت کہاں اتنی کوئی ڈھونڈے
کدھر ہے عیشِ رفتہ اور کہاں ہے عشرتِ فانی

ہوا برباد گھر لیکن ہے نظروں میں وہی نقشہ
مِری آنکھوں سے دیکھے کوئی میرے گھر کی ویرانی

ہم اپنی جان کے دشمن نہیں پر کیا علاج اِس کا
غموں کی جانِ مضطر پر غضب کی ہے فراوانی

ہزاروں غم ہیں دنیا میں بتائیں نام کس کس کا
غمِ مرشد ہے پر مرشدِ غموں کا ہے یہ وجدانی

خبر بھی ہے کہ اُس جانِ جہاں نے ہم سے منہ موڑا
کوئی بے وجہ ہم اپنے ہوئے ہیں دشمنِ جانی

نہ ہو صبحِ وطن کیوں کر بتر شامِ غریباں سے
فراقِ دلربا میں گھر ہے رشکِ کُنجِ زندانی

خبر ہے جان کو دل کی نہ دل کو جان کی پروا
فقط سینہ پہ ہے ہاتھ اور زانو پر ہے پیشانی

جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہے ہے
پھرے ہیں ڈھونڈتے سرگشتگانِ تیہ بیمانی

جنید و شبلیِ ثانی ابو مسعود انصاری
رشیدِ ملت و دیں غوثِ اعظم قطبِ ربانی

نسیمِ بحرِ رافت فضلِ رحماں منبعِ احساں
قسیمِ فیضِ یزداں ابرِ رحمت ظلِّ سبحانی

زمانہ نے دیا اسلام کو داغ اُس کی فرقت کا
کہ تھا داغِ غلامی جس کا تمغائے مسلمانی

زباں پر اہلِ اہوا کی ہے کیوں اُعلُ ہُبَل شاید
اُٹھا عالم سے کوئی بانیِ اسلام کا ثانی

نکل کر کس نے آبادی سے صحرا کو کیا مسکن
چمن ہے دشت اور گھر میں ہے ویرانی سی ویرانی

وہ صحرا دیکھنے سے جس کے گھر یاد آ ہی جاتا تھا
اب اُس کو یاد دلواتی ہے میرے گھر کی ویرانی

کہاں لوٹیں کہاں تڑپیں کہاں دل کھول کر روئیں
جگر خوں کرتی ہے دارِ فنا کی تنگ میدانی

کفِ افسوس ملنے کی نہ ہو ہاتھوں کو جب مہلت — کریں کا ہے سے پھر زخم جگر کی ہم مگسرانی

ہجومِ رنج و غم جوشِ بُکا کی حد نہیں اب ہم — سراپا دل نہیں یا چشم ۔ ہے یہ سخت حیرانی

خوشی کیا اب کسی غم کی بھی گنجایش نہیں دل میں — غمِ جانکاہِ جاناں کر رہا ہے دل کی دربانی

نہ آئے کس طرح اُن غمزدوں کے حال پر رونا — کہ جن آفت زدوں کی دردِ دل کرتا ہے درمانی

امیدِ مرگ پر جن کا مدارِ زندگانی ہو — ہے قابل دیکھنے کے اُن کی مایوسی و حیرانی

نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنجِ شہیداں سے — تمنّائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سب کی قربانی

اُمیدوں کا ہوا ہے خاتمہ یک لخت ہجراں میں — مرے طولِ اَمل سے بھی الم نکلا یہ طولانی!

مچی ہے عالمِ عُلوی و سفلی میں عجب ہل چل — وہاں ہے غلغلہ شادی کا یاں ماتم کی طغیانی

دمِ آخر ہے ظالم دیکھ لینے دے نظر بھر کر — نہ گھبرا دیدۂ تر کرتے رہنا اشک افشانی

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو — چھپا چاہِ لحد میں وائے قسمت ماہِ کنعانی

چُھپا شمسِ ہدایت اور ہوئے سب مقتبس اس کے — دریغا وائے حسرت پائمالِ سیرِ کیوانی

نظر سے ہو گئے غائب دلوں میں وہ چھپ کے بیٹھے ہیں — دل و دیدہ کی جنگِ باہمی مشکل ہے سُلجھانی

فنائے تام پر بھی بس نخ کی ہے ہے غضب اُس نے — جسے کہتا تھا اِک عالم بقائے عالمِ فانی

نہ سمجھے تھے کہ اُس جانِ جہاں سے یوں جدا ہوں گے — یہ سُنتے گو چلے آتے تھے اک دن جان ہے جانی

تڑپتے تربتِ اقدس پہ اُس کی ہیں کہ ہوتی تھی — درِ دولت پہ جس کے نفسِ امّارہ کی قربانی

غبارِ کوئے جاناں اب تلک باقی ہے آنکھوں میں — سمائے خاک نظروں میں مری کُحلِ صفاہانی

نہ ہوتے گر جُدا قدموں سے اُس سالارِ خوباں کے — تو پھر ہم دیکھ لیتے زوالِ دنیا کی نریمانی

الٰہی کیا کریں کیوں کر سُنیں وہ لحنِ داؤدی — خدایا کس طرح آوے نظر وہ شکلِ نورانی

جب اُن کی صوت و صورت سے ہے محرومی تو بہتر ہے — مرے کانوں کا کر ہونا اور آنکھیں کور ہو جانی

فضائلِ اہلِ جنّتی میں سے کوئی ایک دکھلا دے — کیے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی

غریب و بے کس و عاجز کریں کیا اور کدھر جائیں — گئی ہے میزبانِ خلق کی جنت میں مہمانی

حوائج دین و دنیا کے کہاں لے جائیں ہم یا رب — گیا وہ قبلۂ حاجاتِ روحانی و جسمانی

دُعا کس سے کرائیں پوچھنے فتویٰ کدھر جائیں — سنائے کون گر چاہیں سُنیں ہم وعظِ عرفانی

مقدر تھا سو پیش آیا یہی حسرت ہے اب دل میں — کہ اُس فخرِ اکابر کی نہ ہم نے قدر پہچانی

تن آسانی میں کھوئی عمر ساری کیا قیامت ہے — پشیمانی سے اب حاصل ہے کیا غیر از پریشانی

دلِ سودہ زدہ بہلے یونہی کچھ دوستو شاید — کریں مدح و ثنا میں آپ کی آؤ غزل خوانی

غزلِ مدحیہ

وہ صدیقِ معظّم تھے سحابِ لطفِ رحمانی — وہ شمعِ دین و ملّت تھے گلِ گلزارِ عرفانی

وہ تھے کبریتِ ایمانی وہ تھے یاقوتِ روحانی — ہے کیا کبریتِ احمر اور کیا یاقوتِ رُمانی

قبولیّت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں — عُبَیدِ سُود کا اُن کے لقب ہے یوسفِ ثانی

رقابِ اولیا کیوں خم نہ ہوتیں آپ کے آگے — وہ شہبازِ طریقت تھے محی الدین جیلانی

خدا اُن کا مربّی وہ مربّی تھے خلایق کے — مرے مولا مرے ہادی تھے بے شک شیخِ ربّانی

جدھر کو آپ مائل تھے ادھر ہی حق بھی دائر تھا — مرے قبلہ مرے کعبہ تھے حقّانی سے حقّانی

ہدایت جس نے ڈھونڈی دوسری جا گمراہ ہوا — وہ میزابِ ہدایت تھے کہیں کیا نصِّ قرآنی

فقیہِ باخبر ایسا کوئی یارو بتائے تو — ہو جس کا علم اذعانی ہو جس کا حکم ایقانی

رُخِ زیبا ہو جس کا مظہرِ ادعی من السامع — محدّث ایسا دیکھیں گے کہاں اے وائے حرمانی

مفسّر ایسا لائیں گے کہاں سے یا خدا جس کے — ہوں قول و فعل دونوں کاشفِ اسرارِ قرآنی

سراسر حق ہے لا تنقضی عجائبہ پہ کیا کہیے — گیا زیرِ زمیں وہ محرمِ اسرارِ قرآنی

ہو سینہ جس کا مصباحِ نبوت کے لیے مشکوٰۃ — بحرِ مہدی نہ ہوا بے اُن جیسا ہادیِ حقّانی

گدایانِ درِ دولت کے کشکولِ مرقع سے — نظر آتے تھے شرمندہ قبا و تاجِ سلطانی

پھریں تھے کعبہ میں بھی پوچھتے گنگوہ کا رستہ — جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوق و شوقِ عرفانی

دلِ طالب میں کھینچی شاہدِ مقصود کی صورت — بنام ایزد وہ سلطان المشائخ تھے عجب مانی

برومند و شرف اندوز اے سرچشمۂ احساں　　تمہارے خوانِ نعمت سے سدا تھے قاصی و دانی
علائق اور امیدوں کے لیے خدام و اعدا کے　　وہ حلالِ معاقد تھے غضب تیغِ صفاہانی!
جہاں تھا آپ کا ثانی وہیں جا پہنچے خود حضرت　　کہیں کیوں کر بھلا کس منہ سے مولانا تھے لاثانی
دلوں کو جھانکتے ہیں اپنے اور سب مسکراتے ہیں　　کہا جب ہیں نے مولانا رشید احمد تھے لاثانی
تمہارے خوانِ نعمت سے نہیں تھے فضلہ چیں ورنہ　　کلیسا کی طرف ہرگز نہ جاتے شیخ صنعانی
نوا سنجِ انا الحق فیضیاب ہوتے اگر تم سے　　انانیت کو اپنی جانتے اک حظِ نفسانی
فسادِ میرو مرزا سے بدولت آپ کی شاہا　　غلاموں کو تمہارے کچھ نہ تھا خوف و پریشانی

ایازِ درگہِ عالی کی کفش پا کو شاہِ دیں
تصور کرتا ہے محمودؔ بہ از تاجِ سلطانی

دیگر

عزیزو فکر کیا ہے کس لیے مایوس بیٹھے ہو　　وہ سالارِ طبیباں ہے وا اے دردِ حرمانی
تہی دستو نہ گھبراؤ نہ شرماؤ ادھر آؤ!　　وہ نیسانِ کرم اب بھی ہے سرگرم دُرافشانی
ہدایت کے لیے آئے تھے یاں پاکر فراغت اب　　گئے ہیں تا کریں واں مغفرت کی میر سامانی
شہید و صالح و صدیق ہیں حضرت باذن اللہ　　حیاتِ شیخ کا منکر ہو جو ہے اُس کی نادانی
رہے منہ آپ کی جانب تو بُعدِ ظاہری کیا ہے　　ہمارے قبلہ و کعبہ ہو تم دینی و ایمانی
ضرورت قابلیت کی تو ہر حالت میں ہے لیکن　　قریب و دُور یکساں مہر کی ہے نور افشانی
شہیدِ خنجرِ تسلیم کو ہر دم ہے جاں تازہ　　تفقد میں غلاموں کی نہیں اب بھی ہے آسانی
چھپائے جامۂ فانوس کیوں کر شمعِ روشن کو　　تھی اُس نورِ مجسم کی کفن میں [illegible] عریانی
وفاتِ سرورِ عالم کا نقشہ آپ کی رحلت　　تھی ہستی گر نظیرِ ہستی محبوبِ سبحانی
وہ تھے صدیق اور فاروق پھر کہیے عجب کیا ہے　　شہادت نے تہجد میں قدم بوسی کی گر ٹھانی

فقط اِک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ　　بخاری و بغداد و بصری و شبلی و سیبانی
نہ آئے مہدیٔ موعود اور تم بھی چلے یاں سے　　کرے گا گلشنِ اسلام دلوں [illegible]
جنھیں چھوڑا تھا تم پر حضرتِ امداد و قاسم نے　　کرے گا کون اب اُن بے کسوں [illegible]
یہاں سے ساتھ لے چلنا ہمارا بات ہی کیا تھی　　ترے صدقہ سے وہ ان بھی جو ہی جاتا [illegible]
غلاموں کی تمہارے اے شہِ دنیا و دیں حالت　　اجل بھی دیکھ کر ہنستی ہے لیکن [illegible]
تمہاری تربتِ انور کو دے کر طور سے تشبیہ　　کہوں ہوں ہائے بار ارِنی مری [illegible] نادانی
اجل تھی آپ کی مرموز بطنِ الارض خیر ہیں　　کہو پھر دوستو کیا ہم نے تہ کی بات پہچانی
ہمارے واسطے ہے دشتِ غربت اور غمِ فرقت　　مبارک آپ کو شاہا ہو سیرِ باغِ رضوانی
تمہارے فیض سے اب بھی توقع ہے اگرچہ ہوں　　اسیرِ قیدِ نفسانی رہینِ کیدِ شیطانی
طفیلِ مرشدِ عالم رشید الدین والملت　　نکل جائے غمِ فرقت میں دم با نورِ ایمانی

قطعۂ تاریخِ وفات شریف

کلیجہ کیوں نہ شق ہو آہ مُنہ بھر بھر کے کہتے ہیں　　زبانِ حال سے ارض و سما و انسی و جانی
محی الدین اکبر جاتے ہیں دارِ فنا سے بس　　اُٹھے اُف دیدۂ ویراں سے محی الدین گیلانی
١٣　ھ　٢٣　　　١٣　ھ　٢٣

قِطعہ

نبی کی تاب لائی ہے دلِ بے تاب آخرکار　　سُناتا ہے ہر اِک کو واعظِ رب حکم حقانی
چو ختم الانبیا رفتند دیگر کیست کو ماند　　مگر ذاتِ مقدس قادرِ قیوم سبحانی

قطعہ تاریخ فارسی

بر وفات سید احمد خاں سی۔ ایس۔ آئی

سر سید احمد خاں ۱۷ ر اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد متقی کا تعلق مغلیہ دربار سے تھا۔ سر سید نے دہلی کے نامور اساتذہ سے تعلیم پائی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ سر سید کو مغلیہ دربار سے "جواد الدولہ عارف جنگ" کا خطاب ملا تھا۔ لیکن وہ مغلیہ دربار سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وفادار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے معرکے میں انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، اور اس کے صلے میں اعزاز و اکرام سے نوازے گئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام ہے لیکن خدمات کا دائرہ تعلیم سے لے کر ادب، صحافت، مذہب، سیاست، تہذیب اخلاق اور اصلاح رسوم تک پھیلا ہوا ہے۔ اِن کے فکر اور اندازِ فکر سے علی گڑھ کے ایک مستقل مکتبۂ فکر کی بنیاد پڑی۔ انھوں نے تعلیمی و سیاسی مقاصد سے کئی انجمنیں بنائیں، اخبار جاری کیے، مضامین لکھے اور تصنیف و تالیف کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ ۲۸ ر مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

سر سید جنت دوزخ کی حقیقت، فرشتہ و شیطان کے خارجی وجود، عذاب و ثواب، حشر نشر وغیرہ مسائل کے بارے میں علمائے اسلام اور عام مسلمانوں سے مختلف عقائد رکھتے تھے۔ اسی طرح ملکی سیاسیات میں بھی وہ ملک کے حریت پسندوں اور آزادی خواہوں سے اپنا مسلک جُدا رکھتے تھے۔ اُن کے بعض عقائد دینی اور مسلک سیاسی کے بارے میں حضرت شیخ الہند کے فارسی و اردو قطعات تاریخ میں لطیف اور صریح اشارے موجود ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے یہ دونوں قطعاتِ تاریخ مولانا افضال الٰہی دیوبندی کے شکریے کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں (ایس۔ بش)

سی۔ ایس۔ آئی۔ خان بہادر کہ ریختہ — شیرازۂ مخالفت کعبہ و کنشت

دلہا زبیم و دغدغۂ حشر و نشر رفت — وز نعرہائے جن ملک دوزخ و بہشت

از کفر و دین و طاعت و عصیاں نزاع برد — گویا خمیر ہر دو نہ۔ وانگہیں سرشت

مذبوح لحم پخت پئے این و آں وگا — مخنوق مالیاں پئے احباب می سرشت

از پشم و قطن فلسفۂ نو سن بعض — رشتہ برائے جامہ دیں ہیں چہ خوب رشت

نوبت چو آخر شس بدرم واپسیں رسید — احباب را وداع بحسرت نمود و ہشت

شخصے بنغمہ خندۂ شادی ہمی زند — دیگرے بہ غم فتادۂ و سر می زند بخشت

آں مدعی ست کو بہ رماہک رسید و ایں — از ساکنانِ روضۂ رضواں ورا نوشت

در حیرتم فگند و چوں ایں اختلاف فاش — کایں فخر قوم خواندش دیگر زبون و زشت

گفتم دلا چہ سود ازیں کاوِ کاوِ فکر — کے حک شود نقوش کہ کلک قضا نبشت

تاریخ مرگ او بشنیدم ز ہاتفے

سید درود عاقبت امرآں کہ کشت

۱۸ ۶ ۹۸

تاریخ انتقالِ سید احمد در اُردو

محو شیدائے ترقی خیر خواہِ ملک و قوم — سید احمد خانِ ابن الوقت وہ مشہورِ زباں

محفل مردوں میں کیوں ہیں آج صدرِ انجمن — کیا عدم میں بھی تنزل ہو گیا تھا کچھ عیاں

اس رئیس الطائفہ کے واقعے کا تذکرہ — نیکی سے ہو یا بدی سے سب کے ہے وِردِ زباں

مسٹر و لارڈ تک روتے ہیں اس میں شک نہیں — گو غلط ہے روتے ہیں اُن پر زمین و آسماں

اوروں کی دُنیا کو اپنے دین پر ترجیح دی — دوست دارِ قوم پیدا ایسے ہوتے ہیں کہاں

آبیاری مزرعۂ دُنیا کی کی حد سے فزوں — دین پر ہر چند برساتے رہے چنگاریاں

دین کے ارکانِ اربع سے رہے گو بے خبر — آٹھ آٹھ آنسو رہے پر قوم پر گریہ کناں

منکرِ بردہ فروشی تھے بضد پر بہرِ قوم — سر فروشی تک گوارا کی انہوں نے الاماں

حج و عمرہ سے تھے ناخوش بر وجہِ مصلحت — زائرِ لندن بنے گر طائفِ ہندوستاں

گو نہ تھے قائل دُعا کے پر بصد عجز و نیاز — حق میں لارڈ کالون کے کی دعا با صد زباں

تھا گدائی سے تنفر لیک کالج کے لیے — ڈال کر جھولی گئے پیشِ درِ نواب و خاں

جادۂ دیں پر نہ تھے قائم مگر کہتے رہے — زینۂ بامِ ترقی بر اَلا یا قوم ہاں

دشمنِ دینی تھے دانا دنیوی نادان دوست — پر کرے تصدیق اس کی کون بجز صاحب دلاں

ہم نے یہ مانا بدل ڈالے سب احکامِ نصوص — دشمنانِ دین کی بس دی مگر بالکل زباں

قوم کے سب مِلّ کل ریفارمر اور نیچرل — کیوں نہ ہوں نوحہ کناں گرم فغاں سینہ زناں

جملہ یارانِ لباسی مہدی و حالی نذیر — پیٹتے ہیں سر کہ ڈھونڈیں ہائے سید کو کہاں

صنعت توجیہہ میں کہتا ہے یہ ہاتف سنو

مانتے جس کو نہیں تھے ہیچے پہنچے وہاں

۱۵ ھ ۱۳

قطعۂ تاریخِ وفات

مولانا قاری حافظ محمد اسماعیل رؔاندیری

مولانا افضال الٰہی دیو بندی کی عنایت سے راندیری مرحوم کے دو قطعات تاریخ وفات درج کیے جاتے ہیں ۔ ان کے حالات تک رسائی نہیں ہو سکی ۔ مولانا افضال الٰہی نے مرحوم کی تاریخ وفات ۲۴ ۔ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ (۱۳ ۔ مارچ ۱۹۱۲ء) درج فرمائی ہے ۔ (ا ۔ س ۔ ش)

عالم و حافظ و وجیہ و نبیہ — نیک رو نیک خو فرشتہ شیم

آج دار البقا کو جاتے ہیں — چھوڑ کر سب کو مبتلائے اَلَم

غربا کے لیے ہے یوم عسیر — ہو مبارک انہیں نعیم و ارم

ہے مساجد میں یاس اور حسرت — اور مدارس میں چھا رہا ہے غم

فقراء کے لیے تھا آبِ بقا — خضر تھا بہر اہلِ جود و کرم

آج مسکیں یتیم رہ گئے سب — اور یتامیٰ میں مسکنت تو ام

سنتا تھا دور سے صدائے ضعیف — تھا تو سامع مگر نہیں تھا اصم

دم عیسےٰ و لحنِ داؤدی — چھپ گئے ہائے زیرِ کتم عدم

فکرِ سالِ وفات ہے بے سود — ہے ہر اک دل پہ سانحہ یہ رقم

ہاتف سے ہیں اجل لے بے مہر پا

فضل و علم و تقا و ورع و کرم

۳ ھ ۱۳

قطعہ دیگر

تقی و نقی و سمی ذبیح چو زیر کفن چہرہ خود بنفت
زروے بکا سالِ او ہاتفے
ثمال المساکین قدمات گفت

۱۳ ھ ۳۰

قطعۂ فارسیہ تاریخِ وفات

ادیبِ کامل، جامع الفضائل و الکمال جناب مولانا مولوی فضل الرحمٰن صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہم

مولانا فضل الرحمٰن دیوبند کے عثمانی خاندان کی نامی گرامی شخصیت، دہلی میں مولانا مملوک العلی سے تعلیم پائی تھی۔ دیوبند کے بانیوں میں سے اور اس کی شوریٰ کے رکن رکین تھے۔ فارسی و اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بریلی میں انسپکٹر مدارس تھے۔ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں انتقال ہوا۔ مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا شبیر احمد عثمانی ان کے نامور فرزند اور یگانۂ روزگار علماے دین تھے۔ (ایس یش)۔

صد حیف کہ روشن دل و دانا ز جہاں رفت — ہیہات کہ سرمایۂ دانش زمیاں رفت
فریاد کہ آں مرکزِ فضل و ہنر و عقل — چوں تیر ازیں دائرہ با پُشتِ کماں رفت
صافی دلے صاحب نظرے نادرہ گوے — دانشورے عالی گہرے فخرِ زماں رفت
بلبل ز چمن دُر ز عدن شمع ز محفل — از باغ کدیور شد و از گلہ شباں رفت
سہل است اگر مُردجواں ہیچ مدانے — دشوار ہمیں ست کہ پیرِ ہمہ داں رفت
افسر ز سرِ مدرسۂ دین بیفتاد — از در سگہ شرع متیں عزت و شاں رفت
از بانی و اسلاف دریں مدرسہ باقی — بود ست ہمیں فضل صد افسوس ہماں رفت
از آتشِ سوزاں نرود بہ سرِ خاشاک — ظلمیکہ بگلزارِ من از دستِ خزاں رفت
آمد دگرم بوے یتیمی بہ مشامم — غم ہمن و صنوِ پدرم چوں ز جہاں رفت
بربے کسیٔ خویش ہمی نالم و ناداں — گوید کہ چرا گریہ کنی او بجناں رفت
گر مُردنِ او مُردنِ ما شد بعجبے نیست — صد حیف کہ از کالبدِ مدرسہ جاں رفت

۱۳ ھ ۲۵

قطعۂ اُردو

مشتمل بر تاریخِ وفات مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی ممدوح الصدر رحمۃ اللہ علیہ

یہ باغِ علم میں کیسی چلی ہوا ہے ہے
کہ رنگِ چہرۂ گل سے ہُوا ہُوا ہے ہے

خراب حیف ہُوا بوستانِ فضل وکمال
وہ نخلبندِ معانی کِدھر گیا ہے ہے

یتیم آج نہ کیوں کر ابوالمدارس ہو
اَب کریم جو باقی تھا چل دیا ہے ہے

بلا ذو مہرِ مجسّم، مربّی و مشفق
نظر میں ایک بھی باقی نہیں رہا ہے ہے

تھا جس کی رائے سے جامِ جہاں نما محجوب
لیا ہے مُنہ پہ کفن اُس نے بَر ملا ہے ہے

ہے موج پُر خطر اور ہے سفینہ بے لنگر
کہاں ہے کوئی بتائے تو ناخدا ہے ہے

گرہ ہیں سخت نہیں ناخنوں میں جاں باقی
کہاں سے لائیں گے ناخن گرہ کشا ہے ہے

چلے ہیں مدرسہ تو آپ چھوڑ کر کس پر
نہ رحم چھوٹوں پہ آیا تمہیں ذرا ہے ہے

دِوانہ پڑھتا ہے کیا شعر سُن ذرا ہمدم
یہ فکرِ سال بتا کیوں ہے جانگزا ہے ہے

بقیۃ السلف الصالحین وا ویلا

بس ایک دم تھا سو وہ بھی گیا ولا ہے ہے

۵۹۲

۷۳۳ = ۱۲۲۵ھ

قطعۂ تاریخ وفات

حضرت تاج العلماء مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید احمد حسن امروہوی حضرت قاسم العلوم کے خاص تلمیذ اور حضرت شیخ الہند کے رفیقِ درس تھے۔ مولانا احمد علی محدّث سہارن پوری، مولانا شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا عبدالقیوم بھوپالی ابن مولانا عبدالحی بڈھانوی سے سنداتِ حدیث حاصل کی تھیں اور سلوک وطریقت کے اسرار حضرت امداد اللہ مہاجر مکی سے سیکھے تھے اور خلافت پائی تھی۔

امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ ابن کے خاندان سے اور سید اکبر حسین رضوی کے بیٹے تھے۔ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں ولادت ہوئی تھی، اور ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ (۱۸ مارچ ۱۹۱۳ء) کو وفات پائی۔

درس وتدریس کی خدمات خورجہ، سنبھل، دہلی، مراد آباد، دیو بند اور امروہہ میں انجام دیں، اور ہر جگہ سربلند وارجمند رہے۔ کل علوم اسلامی اور ان کی تمام شاخوں میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ فقہ، حدیث اور تفسیر سے خاص شغف تھا۔ تقریر میں، خواہ درس کی ہو خواہ جلسۂ وعظ کی، کمال حاصل تھا۔ علوم شریعت ہی کی طرح سلوک وطریقت میں بہت بلند مقام کے مالک تھے۔

جمعیت الانصار (دیوبند) کے اجلاس مراد آباد (۱۹۱۱ء) کے صدر آپ ہی تھے۔ حضرت قاسم نانوتوی کی سیاسی انقلابی پارٹی سے تعلق تھا۔ آپ کی طبیعت پر عجز واخفا کا غلبہ تھا اس لیے علم میں تبحر، سلوک میں رفعت اور سیاست کا ذوق پوری طرحِ نمایاں نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود آپ کے ہزاروں تلامذہ، خلف الرشید مولانا

سید محمد رضوی علیہ الرحمہ کے ذریعے آپ کا فیضانِ علمی دُور دُور تک پہنچا، اور مدرسہ جامع امروہہ کے ذریعے اب تک جاری ہے۔ کئی کتابیں تصنیف فرمائیں "افاداتِ احمدیہ" آپ کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

(ا۔س۔ش)

گم ہوئی ہے آج صد حسرت ہمارے ہاتھ سے … حضرتِ قاسم نشانی دے گئے تھے اپنی جو
سید العلما امام اہلِ عقل و اہلِ نقل … پاک صورت پاک سیرت صاحبِ خلق نکو
معدنِ علم و حکم سردفترِ اہلِ کمال … عازمِ خلدِ بریں ہے جس کو چلنا ہے چلو
جب شبیہِ قاسمی سے بھی ہوئے محروم ہم … تم ہی بتلا دو کہ پھر ہم کیا کریں اے دوستو
درد یہ پہنچا ہے سب کو اس کا منکر کون ہے … ہاں مگر اِک فرق ہے تھوڑا سا گر میری سنو
لوگ کہتے ہیں پہلے علامہ احمد حسن … اور میں کہتا ہوں وفاتِ قاسمی ہے ہو نہ ہو
کامل و اکمل سبھی موجود ہیں پر اس کو کیا … جو کہ مشتاقِ ادائے قاسمِ خیرات ہو
اپنی اپنی جائے پر قائم ہیں سب اہلِ کمال … پر جگہ اُستاد کی خالی پڑی ہے دیکھ لو
ہاں جنونِ اتحادِ قاسمی میں بارہا … تم کو ہم کہتے تھے من اور آپ کو کہتے تھے تو
مجمعِ حسرت قرینِ درد و غم میں میں بھی تھا … فکر میں تاریخ کے سب نے کیا جب سر فرو

بادلِ پُر یاس آئی کان میں میرے صدا
حیف ہوئی تصویرِ قاسم صفحۂ دنیا سے لوٹ

---

(۱) یہ قطعہ تاریخ ماہنامہ القاسم۔ دیوبند، جمادی الاول ۱۳۳۰ھ ص ۵، ۶ سے ماخوذ ہے۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی مدیر القاسم و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس قطعہ تاریخ وفات کے سلسلے میں لکھا ہے:

"یہ قطعہ تاریخ حضرت مولانا محمود حسن صاحب عم فیضہم کی تصنیف ہے۔ آپ نے بعض خدام کی درخواست پر بروز جلسہ دارالحدیث صبح کو لکھ دیا تھا اور بندہ مدیر نے پڑھ کر جلسے میں سنایا تھا۔"

قطعہ تاریخ وفات

جناب دیوان محمد یٰسین صاحب مرحوم خادم خاص حضرت قاسم العلوم و الخیرات نوراللہ مرقدہٗ

محدود مطالعے اور پائے تحقیق کی کوتاہی کی بنا پر حضرت دیوان صاحب مرحوم کے حالات تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن اگر ان کے سوانح حیات مہیا بھی ہو جاتے تو ان کے اس اشرف میں کوئی اضافہ نہ ہوتا جو انھیں حضرت قاسم العلومؒ کی خدمت کی نسبت سے حاصل ہوا، اور یہ شرف علم و نسب کے شرف سے ہزار درجہ زیادہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اُن کی وفات پر آنسو بہائے، اور جگر لخت لخت کو صفحہ کاغذ پہ سجایا ہے۔ کون ہے جسے حضرت قاسم العلوم سے ان کی نسبت اور حضرت شیخ الہندؒ کی اُن سے عقیدت پر رشک نہ آئے گا۔ مگر ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء مولانا افضال الٰہی دیوبندی نے لکھا ہے کہ ۷۔ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (۱۴۔ فروری ۱۹۱۳ء) کو دیوبند میں انتقال فرمایا۔ مقبرہ قاسمی میں دفن کیے گئے (ا۔س۔ش)

زاں چہ اندیشم کہ زیرِ خاک باشد جائے من … رفت چوں زیرِ زمیں قلب و سر و اعضائے من
آں چناں رفتہ عزیزان و بزرگان زیرِ خاک … خاک افشانم کہ گردد جائے ایشاں جائے من

آں بزرگاں داغ دیگر بر دلم دادند حیف — کز ازل داغ از وشاں بود بر سیمائے من
آں عزیزانے کہ منزل در سویدا داشتند — ہست در سودائے شاں ایں شیون و سودائے من
چوں بگوشِ رفتگاں نتواں رسد بازم چہ سود — آسماں صحن قیامت شد گر از غوغائے من
بود باقی از گروہِ اصفیا صاحب دلے — از سرم دامن کشاں بگذشت آنہم وائے من
آں نکو صورت کہ بودہ قلبِ قرآں نام او — واں نکو سیرت کہ بودہ مامن و ماوائے من
جاں نثار و والہ و دلدادۂ مخدومِ من — مخلص و ممدوح و مخدوم و کرم فرمائے من

بازبانِ یاس اکنوں می سرایم نغمۂ
ملجاءِ ہاہ مرد یعنی خادم مولائے من

قطعاتِ تاریخ واقعۂ جاں کاہ

مولانا حکیم سید نصرت حسین کوڑہ جہاں آباد (ضلع فتح پور ہسوہ) کے ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی۔ مستند طبیب بھی تھے۔ حضرت شیخ الہند سے نسبت تلمذ اور تعلق بیعت کا شرف حاصل تھا۔ حج میں حضرت شیخ الہند کا ساتھ ہو گیا تھا۔ حضرت کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا تھا اور جزیرہ مالٹا میں حضرت کے ساتھ ہی قید کر دیے گئے تھے۔ اگرچہ وطن کی غلامی کا دل پر داغ تھا لیکن سیاست سے عملی تعلق نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند کی معیت کے سوا ان پر کوئی الزام نہ تھا۔ کئی بار ان کی رہائی کے مواقع آئے، رفقائے اسارتِ مالٹا نے بہ شمول حضرت شیخ الہند رہائی حاصل کر لینے کے لیے اصرار بھی فرمایا لیکن ان کی محبت اور وضع داری نے گوارا نہ کیا کہ حضرت کو قید میں چھوڑ کر اکیلے رہائی حاصل کریں۔ نہایت متقی، سلیم الطبع، منکسر المزاج اور وضع دار شخص تھے۔ ان کی وفات پر حضرت شیخ الہند کے دو فارسی قطعات تاریخ یادگار ہیں۔ ان قطعات میں حضرت نے اپنے غم کے اظہار کے ساتھ، ان کے اخلاص، فضل و کمال کی جامعیت اور سیرت کے محاسن کا ذکر فرمایا ہے۔ ۹۔ ذی قعدہ ۱۳۳۷ھ / ٦۔ اگست ۱۹۱۹ء کو مالٹا ہی میں وفات پائی اور وہیں کی مٹی میں آسودۂ خاک ہیں۔ (ا۔ س۔ ش)

هو الغفور الرحیم

فغاں کہ مولوی نصرت حسین جامئ دیں — کہ بود جامع فضل و کمال و لطف و کرم
بہ اسیرِ مالٹہ در عین عنفوانِ شباب — قدم ز قیدِ فرنگ و حیات زد بعدم

بہ غیر قتل و سلاسل درجۂ شہادت یافت — زفضل رحمتِ ربِ غفور جلّ و عمّ
زمخلصاں کہ پئے زاں گذاشتی ہمہ را — چہ شد کہ چشم بہ بستی و رُخ نہفتی ہم
چرا گناہ گرفتی دریں دیار بغیض — گذاشتی رفقارا اسیرِ حسرت و غم
بہ شوق خلد مگر آنچناں شدی مُضطر — کہ ہر دو قید بہ یکبارگی زدی برہم
جُدا شدیم چو از یار واز دیار کنوں — کجا روم چہ کنم حالِ دل کرا گویم
بدوستاں مگر آموختی طریق خلاص — جزاك ربّك یاخیرنا صحِ مفحم
بچشم اشک فشان و بخاطرِ غمگیں — بحالِ حزن و تاسّف چو سر فرو کردم

سروش گفت پہ نالی مگر نمی بینی
رہائی یافتہ از ہر دو قید در یکدم

۷ ۳ ۱۳ ھ

دیگر

نو بادۂ گلشنِ سیادت — از پا بسر او فتاد راصد حیف
آلِ نصرت حسین راحتِ دل — رو سوے عدم نہادہ صد حیف
سرمایۂ لطف و شادمانی — صد داغ بدل نہادہ صد حیف
خاک رفقاے بے کس و کو — صد حیف بباد دادہ صد حیف
از قیدِ فرنگ آمدہ تنگ — پا سوے عدم نہادہ صد حیف
زیں بزم گریز ناگزیر است — درد ہر کسیکہ زادہ صد حیف

زیں زمزمہ پُر صدا است گوشم
شمشاد زپا فتادہ صد حیف

۷ ۳ ۲ ۱ ھ (مالٹہ محرم ۱۳۳۸ھ)

ﷺ به تخفیف الف

ترجیع بند در مرثیہ

حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ

حضرت رائے پوری کا وطن کا تگری ضلع انبالہ تھا اور جائے سکونت رائے پور (ضلع سہارن پور) تھی۔ اسی نسبت سے شہرت پائی۔ سہارن پور میں تعلیم کے مراحل طے فرمائے۔ سلوک کا ذوق بچپن سے تھا۔ حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت اور حضرت کے خلیفہ مجاز تھے۔ تبحر علمی کے ساتھ سلوک و طریقت میں اونچے پائے کی شخصیت اور مقرب بارگاہ الہیٰ تھے۔ دارالعلوم دیو بند اور مظاہر العلوم سہارن پور کے سرپرست تھے۔ عملی سیاست سے حضرت کا تعلق نہ تھا۔ لیکن تحریک شیخ الہند کے رکن رکین اور خاص افراد میں سے تھے۔ حضرت شیخ الہند کے زمانہ اسارت مالٹا میں حضرت رائے پوری کا وجود گرامی ہندوستان میں تحریک کے لیے ڈھارس کا باعث تھا۔ حضرت نے بڑے نازک حالات میں جماعت شیخ الہند کو منتشر ہونے سے بچائے رکھا تھا۔

۲۶۔ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ / ۲۹۔ جنوری ۱۹۱۹ء کی شب میں انتقال فرمایا۔ رائے پور میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔ حضرت شیخ الہند کو مالٹا میں آپ کی رحلت کی خبر پہنچی تو حضرت نے آپ کے مرثیے میں ایک طویل و پر درد ترجیع بند تحریر فرمایا جو حضرت کے روحانی کمالات، مراتب عالیہ، زہد و ورع، خشیت وللہیت اور سیرت کے فضائل میں یادگار ہے۔

(ا۔ س۔ ش)

ھو الملھم للسداد

قبلہ و کعبۂ امانی مُرد
عارفِ حکمتِ یمانی مُرد
زینت و زیب الف ثانی مُرد

عالم و حافظِ مثانی مُرد
طائرِ عرش آشیانی مُرد
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

حاملِ دین و حافلِ حسنات
قاسمِ فیض و جامعِ اثبات
زینت و زیب الف ثانی مُرد

خازنِ خیر و کافلِ برکات
سایۂ لطف رحمت مہدات
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

رہنمائے مسالکِ ایماں
رہ نوردِ مراحلِ احساں
زینت و زیب الف ثانی مُرد

رہگرائے منازلِ ایقاں
ساقیِ بزمِ وحدت و عرفاں
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

نورِ چشمِ اکابر و اعلام
سرپرستِ مدارسِ اسلام
زینت و زیب الف ثانی مُرد

ملجاؤ مامنِ خواص و عوام
مردمِ دیدۂ رشید انام
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

راسِ صلحاؤ سید علما
مسند آرائے محفلِ عرفا
زینت و زیب الف ثانی مُرد

رونق افزائے حلقۂ فقرا
شمع و تاجِ مجلسِ غربا
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

بحرِ الطاف و ابرِ جود و سخا
کوہِ تمکین و کانِ علم و حیا
زینت و زیب الف ثانی مُرد

روحِ اخلاق و بانِ صدق و صفا
بدرِ آفاق و شمسِ عزّ و علا
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

چشمۂ فضل و معدنِ احساں
محملِ صدق قولِ فخرِ زماں
زینت و زیب الف ثانی مُرد

کاشفِ رمزِ علم القرآں
خیرکم من تعلم القرآن
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

قامعِ شرک و بدعت و الحاد
رہرو و رہبر و ہاد و نجاد
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد

پاک رو پاک باز و پاک نہاد
مشفق و جاں نثارِ اہلِ وداد
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

صوفی و صافی و صفیِ اوّاب
خاشع و خاضع و رضی رحاب
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد

فانی و باقی و تقی توّاب
لم یکن فاحشا ولا سخّاب
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

مرہمِ زخمِ خستہ و ناکام
نادمِ شرع و جانشینِ کرام
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد

دستگیرِ اراملِ و ایتام
رحمتِ ذوالجلال والاکرام
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

ہمرہِ ہمرہانِ واویلا
ہمدمِ ہمدمانِ واویلا
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد

ہمروِ ہمروان واویلا
ہمدمِ دوستانِ واویلا
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

باغِ امید میں خزاں افسوس
مرگ اور عیسیِ زماں افسوس
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد

خاک میں گنجِ شائگاں افسوس
سرو ہو شمعِ خاوراں افسوس
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

نازش و فخرِ دوستاں نہ رہا
قدر افزائے خادماں نہ رہا
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد

نورِ بازوئے ہمرہاں نہ رہا
لو حُدیٰ خوانِ کارواں نہ رہا
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

سینہ کل تک تھا محشرِ آمال — آج بیٹھے ہیں کیسے فارغ بال
جی میں کوئی ہوس رہی نہ خیال — جینا آتا نظر ہے کیوں جنجال
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

قبر ہو تیری جب دل صد پاک — آرزوئیں نہ کیوں ہوں سب تہِ خاک
ہو تبدل جو ایسا حیرت ناک — دل نہ ہوں آرزوے کیسے پاک
زینت و زیب الف ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

ہوئے عثمانؓ جامعِ قرآں — دِہ بدہ تم تھے قاسم فرقاں
تم بلاشک تھے نائبِ عثمانؓ — آج سنسان کیوں نہ ہو میداں
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

آئی ہے جن بحار میں کو خبر — تلخ ہی وہ رہیں گے تا محشر
احمر ابیض ہیں غم میں سب اخضر — موجیں کہتی ہیں سمجھے کوئی اگر
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

آتا یورپ میں غم بھلا یہ کہاں — تیرے دلدادہ گر نہ ہوتے یہاں
کس کے گھر ہوتا آن کر مہماں — کس سے سنتا کہو یہ آہ و فغاں
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

سر پہ اس کوہ کو اٹھاتا کون — گردن اُس کے لیے جھکاتا کون
دل کے اندر اُسے بٹھاتا کون — پڑھ کے یہ روتا اور رُلاتا کون
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

ہم جو اس کوردہ میں آ دھمکے — پیش خیمہ تھے تیرے ماتم کے
ہم ہی مونس ہیں یاں ترے غم کے — لب پہ آتا ہے ساتھ ہر دم کے
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد

تم نے تنہا سفر کیا یاں سے — پہنچے پر واں، جہاں ہیں سب اپنے
رحم اُس پر جو دشمنوں میں پھنسے — مشغلہ کچھ نہ ہو بجز اس کے
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

چھوڑ جانا ہمیں اور اتنی دُور — بے کس و کوو بے بس و مجبور
تھا مروت سے آپ کی بس دُور — اب بجز اُس کے کچھ نہیں مقدور
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد

خستہ حالوں سے اے ستودہ صفات — بے نیازی نہیں کمال کی بات
کیوں نہ ہو پھر حیات رشکِ ممات — باوفا جب کرے جفا ہیہات
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

آپ کے ضبط و حلم سے ہے بعید — قیدِ ہستی کو سمجھو اتنا شدید
سخت جانی ہے اُن کی قابل دید — قیدِ دُہری اور اُس پہ ہو یہ مزید
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد

قید دُہری ہے اور تری دلبند — آپ کو ایک بھی ہوئی نہ پسند
چل دیے کیسے خرم و خورسند — مستمندوں کو چھوڑ کر پابند
زینت و زیب الف ثانی مُرد — شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد

تیرے ملنے کی اِک تمنا پر — زندگانی جو کر رہے تھے بسر
کہیے اب کیا کریں وہ خستہ جگر — جینا آج اُن کو کیوں نہ ہو دوبھر
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد

تو نہ ہو جب جہاں میں جلوہ فزا — نیم جاں کچھ دنوں جیے بھی تو کیا
اب رہائی کا بھی مزہ نہ رہا — ہند ہے مالٹا سے آج سِوا
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد — شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد

ہند چلنے سے ہے کِسے انکار　　سر کے بل چلنے کو ہیں ہم تیار
پر سمجھ بے یہ خوب او غم خوار　　نار ہے بے دیار ہے بے یار
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
دردِ فرقت میں تیرے وحی فداک　　دِل ہیں غمناک سینے ہیں صد چاک
ہے زمیں سخت اور دور افلاک　　نالہ ہے اور یہ شعر حسرت ناک
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
رائے پور تجھ سے تھا محطِ رجال　　ہوتا تھا ہر طرف سے شدِّ رحال
اہلِ مصر و قریٰ کا تھا اک حال　　ہوگیا آج سب وہ خواب و خیال
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
ایک دم سے ترے بفضلِ خدا　　تھا وہ اُمّ القریٰ و اُمّ قریٰ
آج ہُو کا مکان ہے اے وا　　گونجتی پھرتی ہے فقط یہ صدا
زینت و زیب الف ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
تھی ہمیشہ سے تیری جائے قرار　　جَنَّۃٌ مَاءُ نَهرِهَا مِدْرَار
اب وہ ہے نہرِ چشم دریا بار　　ہاتھ مل مل کے کہتے ہیں اشجار

زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
محیِ علم تھے امام غزال　　تم تھے احیا کنندہ اعمال
کرتے تھے مردہ سنتوں کو بحال　　آج اُن کی کرے گا کون سنبھال
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
کہتے تھے سُن کے حادثے پیہم　　کریں کس کس کا غم الٰہی ہم
بن گیا سب غموں کا آج اِک غم　　ہوگئے ایک غم میں سب مُدغم
زینت و زیب الف ثانی مُرد　　شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

سب غموں میں تو آگئی خفّت　　پر ترے غم میں بڑھ گئی شدّت
یہی ادغام کی ہے خاصیت　　نوحہ اب یہ ہے ہو کوئی آفت
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
بارِ احباب کون اٹھائے گا　　آنکھوں پر کون اُنھیں بٹھائے گا
ہاتھ کون اُن کا اب بٹائے گا　　فتنوں کو کون اب ہٹائے گا
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
روٹھوں کو کون اب منائے گا　　ٹوٹوں کو کون اب ملائے گا
بگڑوں کو کون اب بنائے گا　　جھگڑوں کو کون اب مٹائے گا
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
ہمد مورائے کس سے لوگے کہو　　مشورے کس سے اب کروگے کہو
رازِ دِل کس سے اب کہوگے کہو　　رائے پور بھی کبھی چلوگے کہو
زینت و زیب الفِ ثانی مُرد　　شاہِ عبدالرحیم ثانی مُرد
ہو مبارک تمہیں باذن اللہ　　رحمت و فضل و قربِ حق یا شاہ
غربت و حسرت و فراق میں آہ　　درد اپنا تو ہے یہ شام و پگاہ

زینت و زیب الف ثانی مُرد
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد

پُر درد نظم مشتمل بر مرثیہ و تاریخ وفات

جامع العلوم والفنون مولانا غلام رسول مدرس دار العلوم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ الہند نے یہ پُر درد نظم مولانا غلام رسولؒ کی خبرِ وفات سن کر لکھی تھی اور بھیجی تھی۔ یہ نظم کلیات میں شامل ہے۔ مولانا غلام رسول بفہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام عبدالرزاق ابن عبدالرحمن تھا۔ تقریباً ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے علاقے میں تحصیل علمی کے بعد دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۳۰۱ھ سے وفات (۱۳۲۷ھ) تک دیوبند میں مدرس رہے۔ حضرت شیخ الہند سے خاص تعلق تھا۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا سید حسین احمد مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا اعزاز علی، میاں اصغر حسین، مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم دہلوی، مولانا عبدالرحیم پوپل زئی وغیرہ نے آپ سے تحصیل علمی فرمائی تھی (ا۔س۔ش)

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

محبّ و شفیق و معظّم مکرم — وجیہ و نبیہ و موفّق مُیَسَّر
علوم و فنون و معارف کے محمل — نجابت کے مورد شہامت کے مصدر
محیطِ علومِ شریعت کے مرکز — فنونِ ریاضی و عقلی کے محور
وفا و صفا و فُتُوّت میں راسخ — محیطِ سخا و کرم کے شناور
حلیم و کریم و سعید و مبارک — حسیب و نجیب و نظیف و مطہّر
غلام رسول اُستادِ افاضل — کہ چشمِ جہاں مثل او دید کمتر
ہوئے مدرسہ سے ہمیشہ کو رخصت — دریغا فیا حبّذا موتِ احمر
اُداسی ہے چھائی ہوئی مدرسہ میں — ہیں سکتہ کی حالت میں دیوار اور در
اصاغر اکابر کی ہے ایک حالت — ہیں طلّاب مضطر تو احباب ششدر
چراغِ علوم آہ ٹھنڈا پڑا ہے — دریغا کہ گل ہو گئی شمع انور

غضب ہے کیا سب نے تقسیم لیکن — نہ ہلکا ہوا غم میں ذرہ برابر
سماتا کہاں یہ الم گر نہ ہوتے — زمیں میں مسام اور فلک ہے مقعر
تو غائب ہوا سب کی نظروں سے لیکن — ترا نقشِ اُلفت ہے سب کے دلوں پر
تو شاگردوں کے حق میں تھا ابرِ رحمت — فدا تھے دل و جان سے وہ بھی تجھ پر
تھا کل جن کے سر پر ترا دستِ شفقت — نظر آج آتے ہیں وہ ناک بر سر
لیا دیکھ آنکھوں سے تیری بدولت — نہیں ہوتا دولت سے کوئی تونگر
عجب ہے کہ یہ غم اُسی جوش پر ہے — بحار و جزائر کو بھی قطع کر کر
جو تھا بعد ہم تم میں کیا کچھ وہ کم تھا — قناعت نہ کی تم نے صد حیف اُس پر
ہیں یورپ تلک غمزدہ تیرے ارث — تُراث و بُوا کی ہیں گو تیرے کم تر!
گزاری یونہی مرحبا عمر ساری — کہ دن مدرسہ میں تو مسجد میں شب بھر
مبارک ہو بے خانماں ترک دنیا — اگرچہ تھا ہر اک کے دل میں ترا گھر
مبارک ہو تم کو جوارِ مشائخ — ہمیں بھی اگر یاد رکھو تو بہتر
تری سادگی اور تری سادہ وضعی — غضب کی تھی دلکش بلا کی تھی دلبر
لباس بدن کہتا تھا کس ادا سے — کہ لعلِ گرانمایہ ہے اُس کے اندر
تری چائے پی جس نے فوراً وہ سمجھا — حلاوت ملاحت سے ہے تو مخمّر
ترے حجرے میں جب کبھی ہوتے حاضر — تو آجاتے تھے یاد ہم کو ابوذر رضہ
قدم[ع] چھوڑ کر مدرسہ میں تم اپنا — چلے دارِ فانی سے اللہ اکبر
لو سن لو کہ خود ہاتفِ غیب کہتا ہے — غروب آہ نجم ہدیٰ ہو زباں پر
۱۳ ۲۷

نئی سی نئی رحمتیں ہوویں نازل
تری قبر اور آل و اصحاب سب پر

ع٥ غلام رسول کا قدم یعنی آخری حرف ل اگر چھوڑ دیا جائے تو باقی حروف سے سنہ وفات: ۱۳۲۷ نکل آتے ہیں۔

منظومات

القاسم

یہ اشعار حضرت مرحوم نے ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں ماہنامہ القاسم، دیوبند کے اجرا کے موقع پر کہے تھے اور اس کے اعلان و تمہید اور مقاصدِ اجرا کے طریق پر شائع ہوئے تھے۔

دلم از تقاضائے یاراں براں ست — کہ خوانِ سخن را باخواں فرستد
ز اقوالِ دین و مقالاتِ حقّہ — ہمیں ہدیہ سوئے عزیزاں فرستد
ز انوارِ مصباحِ مشکوٰۃ سُنّت — چراغے بشامِ غریباں فرستد
باحباب از روشنائی خامہ — فروغِ رخِ دینِ دانیاں فرستد
دریں خشک سالی ز بحرِ معانی — بمُردہ دلاں آبِ حیواں فرستد
ز حکمت کہ گشتہ یمانی خطابش — دوائے دلِ دردمنداں فرستد
ز احوالِ پیشینیاں ہم سرودے — بگوشِ حقیقت نیوشاں فرستد
بر رطب اللساناں کہ ہندی نژاد اند — رُطب ہائے عدنان و قحطاں فرستد
بود آں کہ صاحب دلے صبح گاہے — درودے بجانم ز یزداں فرستد

بنازا و آں دوست کو دوستاں را
غذائے دل و راحتِ جاں فرستد

نظمِ تاریخی

درۂ دانیال میں ترکوں کی فتحِ عظیم

۱۹۱۴ء میں یورپ کی عالم گیر جنگ شروع ہوئی تو اگرچہ ترکی جنگ سے الگ رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے جرمنی کے ساتھ اتحادیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینا پڑا۔ اس جنگ میں ترکوں کی شرکت نے اتحادیوں (برطانیہ، فرانس اور روس) کے لیے سخت دشواریاں پیدا کر دیں۔ ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لیے بند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہو گیا تھا۔ ... اس راستے کو کھولنے کے لیے ۱۹ر فروری ۱۹۱۵ء کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے درہ دانیال کے بیرونی قلعوں پر گولہ باری شروع کر دی لیکن اس مہم میں ان کو سخت ناکامی ہوئی، اور ان کے متعدد جہاز غرق ہو گئے۔ اس کے بعد ۵ر سے ۱۷ر مارچ تک دشمن کے متحدہ جنگی بیڑے نے درّہ دانیال پر دوبارہ حملہ کیا، لیکن اُسے دوبارہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تیسری مرتبہ برطانیہ و فرانس نے جزیرہ نمائے گیلی پولی کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر اپنی بری فوجیں اتار کر درّہ دانیال کے قلعوں پر پشت کی جانب سے حملوں میں اپنی ساری قوت صرف کر دی۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے جو اس محاذ پر دشمن کے مقابلے کے لیے متعیّن تھے، نہایت بہادری اور جاں بازی سے اس کے حملوں کو ناکام بنا دیا۔ بالآخر اتحادی حملہ آور ۶ر جنوری ۱۹۱۶ء تک شکست کھا کر پسپا ہو گئے تھے۔" (ترکی از اکمل ایوبی ص ۸۱-۱۸۰)

حضرت شیخ الہند نے اس واقعے کی تاریخ بھی نکالی ہے جو ۱۳۳۴ھ ہے۔ یہ سنہ ہجری ۱۹ر نومبر ۱۹۱۵ء کو شروع ہوا تھا، اور درّہ دانیال کے معرکے میں اتحادی

حملوں کا سلسلہ ۶ جنوری ۱۹۱۶ء تک ختم ہوا تھا۔ اب اگر حضرت نے یہ نظم درّۂ دانیال کے پہلے حملے (۱۹ فروری ۱۹۱۵ء) اور دوسرے معرکے (۵ تا ۷ مارچ ۱۹۱۵ء) کے بعد کہی ہے، تب بھی ۱۹ نومبر ۱۹۱۵ء کے بعد سفر حجاز کے دوران میں کہی گئی، اور اگر آخری معرکوں (... تا ۶ جنوری ۱۹۱۶ء) کے بعد کہی ہے۔ تب بھی ترکی فتح کی کامل تصدیق کے بعد جنوری کے اواخر یا فروری، مارچ ۱۹۱۶ء میں جب کہ حضرت حجاز میں تھے، کہی ہوگی۔ کلیات کے مرتب نے اسے "حالت اسیری" کی تخلیق بتایا ہے۔ حضرت ستمبر ۱۹۱۵ء میں ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے، اکتوبر میں فریضۂ حج ادا کیا تھا، اور دوسرے سال (اکتوبر ۱۹۱۶ء میں) دوسرا حج کرنے کے بعد دسمبر میں حضرت کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ ممکن ہے اتنا وقت (دسمبر ۱۹۱۶ء تک) حالات کی تصدیق میں لگ گیا ہو کہ واقعہ اسارت پیش آگیا ہو۔ لیکن ترکی کے واقعات کی تصدیق کے لیے تقریباً ایک سال کی مدت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اسارت سے پہلے حالت سفر میں نظم کہی ہوگی، اور چوں کہ اس وقت اس کے ہندوستان بھیجنے یا شائع ہونے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اسارت کے خاتمے اور ہندوستان پہنچنے کے بعد نیازمندوں کے علم میں آئی ہوگی، اور انھوں نے اسے زمانۂ اسارت کی تخلیق سمجھ لیا۔ (ا-س-ش)

کیا کہوں اللہ اکبر کیا ہے شانِ دردنیل ۔۔۔ سجدہ گاہِ اتقیا ہے آستانِ دردنیل
رستم و سہراب کے قصے ہیں تقویم کہن ۔۔۔ ہم سے سن لے کوئی آکر داستانِ دردنیل
بے تکلف آئیں سب اعدا کو دعوت عام ہے ۔۔۔ کچھ نہ پوچھو کس قدر بنا ہے خوانِ دردنیل
ہم نے یہ مانا نہیں ہیں گو عزیز و مہرباں ۔۔۔ لندن و پیرس مگر ہیں میہمانِ دردنیل
ہر پیاسے کو پلایا جام لبریز اجل ۔۔۔ آفریں صد آفریں اے ساقیانِ دردنیل
بس ہوئی ایسی کہ بس کہنے کو بھی مہلت نہ دی ۔۔۔ مرحبا صد مرحبا اے میزبانِ دردنیل

مست ہوئے ایسے قیامت تک نہ آئیں گے ہوش ۔۔۔ اللہ اللہ کون ہے پیرِ مغانِ دردنیل
خم جو پیتا خم ہے بھولے گے چھینٹے کے پر ۔۔۔ اس کو سمجھے گا جو ہوگا رازدانِ دردنیل
اے عجب روباہ بازی سے سگِ زردِ شغال ۔۔۔ چاہتے تھے کہ مدعی پاسبانِ دردنیل
کثرتِ جن و شیاطیں سے نہیں خوف و خطر ۔۔۔ شعلہ باری کر رہا ہے آسمانِ دردنیل
تن سے ہو ہو کر جدا سر گرتے ہیں سجدے کے بل ۔۔۔ تھا دلوں میں کس قدر شوقِ نہانِ دردنیل
لندرہ مظلم ہے پیرس کا ہوا ہے جانا رہا ۔۔۔ رنگ دکھلاتا ہے کیا کیا آسمانِ دردنیل
کیا سمجھ کر آئے تھے بتلا تو دو ہم کو مگر ۔۔۔ سمجھے تھے خالہ کا گھر اپنی مکانِ دردنیل
جو کیا کرتے تھے تقسیم بلادِ مسلمیں ۔۔۔ بانٹتے ہیں آج انہیں مور و سگانِ دردنیل
گوشت خم دندانِ سگ کا جو العجائب ماجرا ۔۔۔ دیکھ لو دیکھا نہیں ہوگا میانِ دردنیل
بوتے ہیں گر چاندنی تو پھولتا ہے لالہ زار ۔۔۔ خون سے سینچا ہے کس نے بوستانِ دردنیل
زال و رستم ایک عالم کی نظر سے گر گئے ۔۔۔ جب سے دیکھے اور سنے پیر و جوانِ دردنیل
مٹ گئے سب صفحۂ ہستی سے چوں حرفِ غلط ۔۔۔ جو مٹانے آئے تھے نام و نشانِ دردنیل
سرویہ روس و فرانس و اٹلی و اہلِ فرنگ ۔۔۔ روزِ محشر تک رہیں گے نوحہ خوانِ دردنیل
بحرِ اسود احمر اور احمر جو تھا اسود ہوا ۔۔۔ کس غضب آفت کی تھی سیف و سنانِ دردنیل
ہے وہی ہل من مزید اور ہو چکے کفار ختم ۔۔۔ قہرِ دوزخ ہے الٰہی یا دہانِ دردنیل
سایہ میں اُن کے ہیں سرِ ایرانِ لندن اور فرانس ۔۔۔ رتبہ رکھتے ہیں ہما کا کرگسانِ دردنیل
دم کے دم میں ہو گئی کیسے خزاں رشکِ بہار ۔۔۔ کون ہے ہم کو بتا دو باغبانِ دردنیل
دیکھ لیوے طلعتِ انور کو اگر یک نظر ۔۔۔ دیکھنے ہوں جس کو شیرانِ نیستانِ دردنیل
کج روی پاؤں ہیں دل میں آرزو میں غرور ۔۔۔ کاٹ ڈالے کیا بلا تھی تیغِ برانِ دردنیل
کفر لرزے ہے دل کفار میں ہلتے ہیں جب ۔۔۔ نعرۂ اللہ اکبر غازیانِ دردنیل
نادم و خوار و ذلیل ہیں بزمیں ہیں زرد رو ۔۔۔ خوں سے یعنی سرخرو ہیں دشمنانِ دردنیل

دیگر

منظہرِ حسنِ بکرم ساختہ برنگ سفید — ایں مسجدے کہ سفیدی ازیں شدہ ناپید
تاریخِ ختمِ سفیدی آمداے فلک — تبیضِ مسجد او آمدہ بروے امید
۱۲ ھ ۲۶

دیگر

سالِ ترمیم بالا روے ابا
مسجد شاہ بخاری صاحب

۱۳۲۷ھ تخرجہ الف = ۱۳۲۶م

قطعۂ تاریخ تعمیر مسجدِ دار العلوم دیوبند

تاریخِ دار العلوم دیوبند میں ۱۳۲۷ھ (۱۹۱۰ء) کی کارگزاری کے ضمن میں مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں ایک طویل پیراگراف ہے۔ مصنف تاریخ مولانا سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

"دار العلوم کی مسجد کے لیے زمین کی خریداری کا ذکر ۱۳۲۵ھ کے حالات میں کیا جاچکا ہے۔ اس سال (۱۳۲۷ھ) راندیر (ضلع سورت) کے ایک مخیر تاجر حاجی غلام محمد اعظم صاحب نے مسجد کے مجوزہ تخمینے کے مطابق انیس ہزار روپے عطا فرمائے۔ ۴ ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ کو مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ روداد میں سنگِ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے:

"طلبہ کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے بنیاد رکھی، اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں، اور نہ صرف اینٹیں رکھیں بلکہ اُس دیوار کی کل بنیاد جو بہت ہی گہری تھی، طلبہ نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری۔ طلبہ کے ساتھ کل مدرسین و اراکینِ مدرسہ نہایت ذوق و شوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے، اور بجائے معماروں کے تعمیر کرتے تھے۔ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحبؒ خلف الصدق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ، جناب مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر المدرسین اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بھی دیگر

اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ اینٹیں اور گارا اٹھانے میں شریک تھے۔ سبحان اللہ! طلبہ کا جوشِ مسرت کے ساتھ سنتِ خلیل الٰہی میں مشغول ہونا اور ساتھ میں اشعار رجزیہ اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا، عجیب مؤثر اور پُرجوش سماں تھا۔ شرقی دیوار کی بنیاد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب و حضرت مولانا اشرف علی صاحب و حضرت حافظ قمر الدین صاحب و جناب مولانا احمد صاحب رام پوری و مولانا سعید الدین صاحب و جناب مولانا عبد الحق صاحب پور قاضوی و جناب مولانا ظہور علی صاحب وکیل سرکار بھوپال نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی۔ غرض کہ اس وقت بہت ہی اچھا مجمع علما و صلحا کا موجود تھا۔ والحمد للہ علیٰ ذلک"

یہ بیان تو "روداد" کے حوالے سے ہے۔ اس کے بعد مصنف تاریخ دار العلوم دیوبند لکھتے ہیں:

"مسجد کے دو درجے مسقف ہیں۔ مشرقی بیرونی دیوار پتھر کی ہے، جس میں نہایت نفیس نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ مینار بھی منقش پتھر کے بنائے گئے ہیں، صحن کے آخری حصے میں سنگین حوض ہے۔ رو کار پر سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے، جس میں مندرجۂ ذیل اشعار رشحۂ فکر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب کندہ ہیں:

مَنْ بَنٰی مَسْجِدًا لِلّٰہِ جَلَّ مَجْدُہٗ بَنَی اللّٰہُ لَہٗ مِثْلَہٗ فِی الْجَنَّۃِ۔

در مدرسہ مسجدے بنا شد — ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
بر لوحِ جبینش اسم اعظم[۵۱] — خواندم چو بصحنِ او رسیدم
در سجدۂ شکر چوں فتادم — در گوشِ رسید ایں شنیدم
مقروں شدہ عبادت و علم — در مدرسہ خانقاہ دیدم[۵۲]

۱۳ ھ ۲۸ — ۱۳ ھ ۲۸

---

۵۱ "اعظم" سے اشارہ سیٹھ غلام محمد اعظم مرحوم کی طرف ہے، جن کی فیاضی سے مسجد تعمیر ہوئی تھی (ا۔س بشر)

۵۲ تاریخ دار العلوم دیوبند، مولانا سید محبوب رضوی، ۱۹۸۸ء، کراچی، ص ۲۱۔۲۱۹۔ واضح رہے کہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۱ء) مسجد کی تاریخ تعمیر ہے، تاریخ بنا نہیں (ا۔س بشر)

قطعۂ تاریخ بناءِ مسجد

راندیر (ضلع سورت) کی بڑی مسجد کے اختتامِ کار کا تاریخی قطعہ[51]

یہ مسجد راندیر کے محلہ سپاہی واڑہ میں تھی - اس کے متولی محمد دین ملا صاحب تھے - بوہرہ قوم سے ان کا تعلق تھا، اور اسی قوم کے جذبۂ ایثار سے یہ شاندار مسجد تعمیر ہوئی تھی -

اللہ اللہ اہل راندیر — بر ہمتِ شانِ صد آفرین است
تجدید نمودہ مسجدے کو — ز آثارِ قدیم فاتحین است
در زینت و خوبی و نکوئی — خجلت دہ نقشہائے چین است
ہر رنگ کز وست دلفریب است — ہر نقش درست و دلنشین است
بر روے زمیں ز رحمتِ حق — فردوس برائے مومنین است
بشنو کہ چساں زبانِ حالش — بر ذاتِ عماد نکتہ چین است
ایں مسجد اگر دیگر مساجد — ہستند، ہمین بہترین است
حیرت چہ کنی مگر نہ بینی — متولیِ او امامِ دین است
پر نور شد سپاہی واڑہ — کیں شمعِ ہدیٰ درو مکین است
قائم بادا بہ رفعت و شان — تا سایۂ چرخ بر زمین است
ابر کرم و سخا محمد[52] — برپا کن ایں حصارِ دین است
راندیر کند چو فخر بر طے — سرمایۂ نازشش ہمین است

---

[51] بہ حوالہ ماہنامہ برہان دہلی بابت ماہ جولائی ۱۹۴۶ء -

[52] جناب محمد فینسی مرحوم مراد ہیں، جن کے اہتمام سے مسجد کی تعمیر جدید ہوئی تھی -

یسعیٰ و یقصد ہم فینسیؔ — مشہور بہ فینسی ازیں است
اربابِ کرم ز قومِ بوہرہ — چوں ہمتِ شان بکارِ دین است
تائید و عطائے ایں کریماں — از عمدہ معاونین این است
بادام و درم کسے کہ یا رب — در خدمت ایں شعارِ دین است
الطافِ تو کارسازِ او باد — فضل تو علیہم اجمعین است
تاریخ بناش بے شش و پنج — زَیَّنّٰہَا لِلنّٰاظِرِیْنَ است ۱۳۴۴ھ

○

جس گھڑی اتمام مسجد کا ہوا — کان میں یہ غیب سے آئی صدا
ہے یہ اے محمود تاریخ بنا — سجدہ گاہِ اغنیائے باصفا ۱۳ھ۴۴

✻

اختتامِ کارِ مسجد جب ہوا — میں نے چاہا لکھوں تاریخ بنا
ہاتفِ غیبی نے دی فوراً ندا — ثانیِ بیت المقدس ہے سنا

٭ ٭ ٭

بشنو بشنو ز زبانِ ہاتف
سال او ثانیِ بیتِ معمور ۱۳ھ۴۴

قطعۂ تاریخ موضح فرقان

حضرت شیخ الہند نے اپنے ترجمہ قرآن وحواشی کا نام حضرت شاہ عبدالقادر کے حواشی "موضح قرآن" کی مناسبت سے موضح فرقان رکھا تھا اور اس کا قطعۂ تاریخ بھی تحریر فرمایا تھا۔ لکھتے ہیں:

"موضح قرآن میں یہ خوبی ہے کہ تاریخی بھی ہے۔ موضح فرقان تاریخی نہیں۔ ہاں گھٹا بڑھا کر کچھ تکلف کے بعد تاریخی بھی ہو سکتا ہے۔"

"موضح قرآن" سے ۱۲۰۵ھ نکلتے ہیں۔ "موضح فرقان" کا قطعۂ تاریخ یہ ہے:

یادگارِ شہ عبدالقادر ترجمہ موضح قرآن مجید
وہ کہ آں معدنِ صد خوبی را کرد ترمیم اقل العبید
بے شش وپنج بگفتہ محمود
سالِ او موضح فرقان حمید(۱)

۱۳۳۶ھ

(۲) مقدمہ قرآن مجید مترجم از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، مدینہ پریس بجنور (اشاعت ثانی) ص ۷، ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء یہ ترجمہ اسارت مالٹا کے زمانے میں مکمل ہوا تھا۔

استدراک

کلیات شیخ الہند میں اہتمام کیا گیا ہے کہ قطعات تاریخ کے ساتھ مرحومین کے مختصر سوانح حیات میں درج کر دیے جائیں۔ جب یہ قطعات مرتب کیے تھے تو مولانا محمد اسماعیل راندیری کے حالات دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ کتاب پریس کے حوالے کر دی گئی تو حضرت راندیری کے حالات میں مولانا مفتی کفایت اللہ سلیم شاہجہان پوری ثم دہلوی کا ایک مفصل مضمون دستیاب ہو گیا۔ یہ مضمون ماہنامہ القاسم، دیوبند بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۰ھ میں چھپا تھا۔ یہاں اس مضمون سے مرحوم مولانا راندیری کے بارے میں چند معلومات اخذ کر کے مرتب کر دیے ہیں۔ تفصیلی مطالعے کے لیے اصل ماخذ سے رجوع کرنا چاہیے۔

(ا۔س۔ش)

مولانا محمد اسماعیلؒ راندیری

مولانا محمد اسماعیل راندیر علاقہ گجرات (ہند) کی مشہور دینی شخصیت تھے۔ان کے اسلاف کٹھور کے رہنے والے اور سلاطین دہلی کی طرف سے منصبِ قضا پر فائز تھے۔ مرحوم کے جد امجد نے اعزاز و منصب سے کنارہ کشی اختیار کر کے راندیر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور شیوہ توکل اور خدمت دین کو اپنا وتیرہ بنالیا تھا۔

راندیر اور قرب وجوار کے علاقے میں تحصیل علمی کے بعد تکمیل علوم وحدیث کے لیے بھوپال کا سفر اختیار کیا تھا اور وہاں کے مشہور عالم اور شیخ المحدثین مولانا شیخ حسین محدث انصاری شافعی کی خدمت میں حدیث اور دیگر علمائے عصر سے دوسرے علوم کی تکمیل کی تھی۔

وہ علوم دینیہ کے جید عالم، علم و عمل میں یگانۂ عصر، توکل و تقویٰ کی مجسم تصویر، قرآن حکیم کے بلند پایہ حافظ، بے مثال قاری اود جامع مسجد راندیر کے خطیب تھے۔ لیکن اس خدمت دینی کے عوض انھوں نے کبھی کوئی مشاہرہ قبول نہیں کیا۔ ان کی کچھ خاندانی جائداد تھی اور وہی ان کے گزراوقات کا ذریعہ تھی اور اس میں سے بھی وہ سیکڑوں مسکینوں، یتیموں، بیواؤں کی ماہانہ خدمت کرتے تھے۔اہل علم کے بے حد قدر دان اور طلبہ وعلما سے بہت محبت کرتے تھے۔اکابر دیو بند سے ان کا تعلق بہت قوی تھا۔وہ بہت مخیر اور ایثار پیشہ بزرگ تھے۔مدارس دینیہ کو ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ جہاں دینی خدمت کا کوئی کام ان کی ذاتی مقدرت سے باہر ہوتا تھا، وہ دوسرے اہل خیر کو اس جانب متوجہ کر دیتے تھے۔ حضرت مفتی کفایت اللہؒ لکھتے ہیں:

"مدرسۂ امینیہ دہلی تو گویا آپ کے دست کرم کا ہی لگایا ہوا پودا ہے۔اس کے علاوہ بے شمار مدارس اسلامیہ کو آپ قیمتی امداد

پہنچاتے رہتے تھے۔آپ کی بے شمار قومی و مذہبی یادگاروں میں مدرسہ اسلامیہ دیو بند کی عالی شان و سربہ فلک مسجد نہایت زبردست یادگار ہے جو آپ کی ذراسی توجہ سے آپ کے محترم دوست جناب حاجی سید غلام محمد اعظم صاحب رئیس کی بیش قدر مالی امداد سے تیار ہوئی ہے اور جب تک صفحۂ ہستی پر باقی رہے گی، ان دونوں نیک نفس و خیر مجسم حضرات کی مدح خوانی کرتی رہے گی۔"

قرآن حکیم کی تلاوت اور مطالعہ، کتب حدیث سے خاص شغف تھا اور مسلسل مطالعہ و فکر وتدبر سے قرآن وحدیث میں ان کی نظر بہت گہری ہو گئی تھی۔وہ ایک بلند پایہ فقیہ بھی تھے۔مدرسۂ اشرفیہ راندیر میں وہ عرصۂ دراز تک درس وتدریس علوم و فنونِ اسلامی کی خدمت انجام دیتے رہے تھے۔

۲۴۔ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۳۔مارچ ۱۹۱۲ء کو حضرت مولانا محمد اسماعیل نے راندیر میں سفر آخرت اختیار فرمایا اور جوارِ رحمت الٰہی میں جگہ پائی۔

مولانا مفتی کفایت مرحوم۔نے ان کے فضائل و کمالات ظاہری اور باطنی کی بہت تعریف کی ہے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے دونوں قطعاتِ تاریخ وفات میں مرحوم کے جن فضائل و خصائص و محامد کی طرف شاعرانہ اسلوب میں اشارہ فرمایا ہے۔ مفتی کفایت اللہ مرحوم نے انھیں ان کے سوانح اور سیرت کے واقعات کے طور پر بیان کیا ہے۔

